انگریزی : پروفیسر سو یامانے
اردو ترجمہ: محمد ذیشان اختر

لامساویت سے جنم لینے والی آوازیں:
انیسویں صدی کے آغاز میں ''اردو رسم الخط'' کا تحقیقی مطالعہ

تعارف

اردو ادب کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو انیسویں صدی کے آغاز ہوتے ہی ہمیں ''رانی کیتکی کی کہانی'' کا جنم ملتا ہے جسے اردو زبان کے شاعر انشا اللہ خان انشا نے تحریر کیا۔ یہ اُن کا نثری کام تھا۔ چوں کہ ہندوستان کسی ایک تہذیب کے لیے مخصوص نہ تھا، لہٰذا جب ہم ہندوستان میں نمایاں تہذیبوں اور ان تہذیبوں کی شناخت کے موضوعات کا مطالعہ کرتے ہیں ہیں تو انشا کا یہ نثری کام نہایت دل چسپ معلوم ہوتا ہے، بالخصوص جب ہم اردو اور ہندی تہذیب کی شناخت کے سلسلے میں تحقیق کے گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ انشا کا یہ نثری کام جو دراصل رومانوی حیثیت کا حامل ہے، ایسی لسانی مشق معلوم ہوتا ہے جس میں انشا نے اپنے گردو پیش کے حالات و واقعات بیان کیے ہیں (شیکل اور اسنیل، ۱۹۹۰ء، ص ۸۹)۔ اس نثری سرمائے کے رسم الخط پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ اس میں ہندوی بول چال کے الفاظ اگرچہ فارسی-عربی رسم الخط میں تحریر کیے گئے ہیں لیکن تحریر کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں موجود کوئی بھی لفظ عربی یا فارسی ذخیرۂ الفاظ سے اخذ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نثری مشق میں کوئی تتمہ الفاظ بھی شامل نہیں ہیں۔ یہ نثری کام دو نمایاں خصوصیات کا حامل ہے جو ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی تہذیبی شناخت کے لیے کارآمد ہے، لہٰذا اسے نہ صرف ہندی ادب کی تاریخ میں جدید ہندی نثر کا اولین شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ ذخیرۂ الفاظ اور رسم الخط کے حوالے سے یہ اُردو زبان کے ایک نثری کام کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

ہر زبان کلی طور پر اپنے رسم الخط اور ذخیرۂ الفاظ پر ہی اپنی تہذیبی شناخت قائم کرتی ہے، لہٰذا یہ پہلو

نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ ''رانی کیتکی کی کہانی'' لکھتے وقت انشا کو اس حقیقت کا بہ خوبی علم ہوگا کہ اگر وہ اپنے دیس کی بول چال کی زبان کو خطے کی تہذیبی شناخت کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنی نثری مشق کے لیے فارسی اور عربی زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے کسی بھی قسم کا فائدہ اٹھانے سے گریز کرنا ہوگا اور اپنی بول چال کی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو ہی کھنگالنا ہوگا۔ یہ خیال سب سے پہلے انشا کو ہی آیا ورنہ اس سے قبل اور خود انشا کے دور میں شعرا کی اکثریت اپنا کلام مرتب کرنے کے لیے فارسی زبان اور ریختہ کے الفاظ کشید کرتی تھی اور جب کبھی تہذیبی شناخت کی بات چھڑتی تو یہاں کے اکثر شعرا ہندوستان کی لسانی تہذیب کے تانے فارسی کے بانوں سے جوڑ دیتے۔ ان حضرات کی نظر میں ''ہندوستانی زبان'' کبھی بھی اس خطے کی تہذیبی شناخت نہیں رہی اور نہ ہی اسے دیسی بولی کا درجہ حاصل رہا۔ برعظیم کی لسانی حیثیت پر فارسی زبان کا غلبہ اس قدر تھا کہ اس دور کی رائج الوقت لغات میں زیادہ تر فارسی الفاظ کی تشریح ہی ہوا کرتی تھی جو لغات کی تکمیل کے لیے ایک نہایت ضروری عنصر سمجھا جاتا تھا۔

انشا کے دور میں شمالی ہندوستان کے وسیع رقبے پر بول چال کی ایک ہی زبان تھی لیکن وہ لہجوں کے لحاظ سے منقسم تھی۔ لہجوں کی اس انحرافی کو سب سے پہلے برطانوی حکمرانوں نے ختم کیا۔ انھوں نے شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی ایک زبان کے مختلف لہجوں کو ختم کر کے ایک کو مقامی زبان کا درجہ دینے کے لیے اقدامات کیے۔ نظامِ حکومت چلانے کے لیے ایک مقامی زبان کو رائج کرنا نہایت ضروری تھا اور برطانوی اس کی اہمیت بخوبی سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں کی بولیوں اور ان کے مابین تلفظ و لہجے کے فرق کا تحقیقی مطالعہ نہایت ضروری تھا۔ برطانویوں سے پہلے مختلف یورپی اقوام نے بھی اس ضمن میں تحقیق کی تھی۔ برطانویوں کی اس تحقیق سے ایک دل چسپ بات سامنے آئی کہ شمالی ہندوستان میں ایک ایسی بولی بھی موجود ہے جو تقریباً پورے خطے میں با آسانی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یقیناً یہ ایسی دریافت تھی جس کا سہرا غیر ہندوستانی اقوام کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے فوراً ہی اس زبان کو ''ہندوستانی'' کہنا شروع کر دیا۔ نظامِ حکومت چلانے کے لیے برطانوی عملے کے لیے اب یہ زبان سیکھنا نہایت ضروری ہو گیا، لہٰذا فوراً ہی اس زبان کے قواعد لکھے جانے لگے۔ یہ بات اب تک معلوم نہیں ہو سکی ہے کہ انشا کو اس بات کا علم تھا یا نہیں کہ برطانوی حکمرانوں نے ''ہندوستانی'' کو برعظیم کی مقامی زبان کا درجہ دے کر اس کے قواعد مرتب کرنا شروع کر دیے ہیں، لیکن ذہن اس بات کو قبول کرتا ہے کہ انشا جیسے مشہور زمانہ ادیب تک یہ خبر ضرور پہنچی ہوگی کہ برطانویوں نے ''ہندوستانی'' کو مقامی زبان بنانے کے لیے کوششیں شروع کر دی ہیں۔

ابھی ہندوستانی زبان کے قواعد مرتب کرنے کا کام جاری تھا کہ اس ضمن میں ایک اور انتہائی حیرت انگیز تحقیق ان کے سامنے آئی کہ وہ زبان جسے برطانویوں نے ''ہندوستانی'' کا نام دیا تھا، ایک نہیں بلکہ دو رسوم الخط میں اپنی شناخت اور معیار برقرار رکھے ہوئے ہے اور انھی دو رسوم الخط میں مستعمل ہے۔ اول رسم الخط میں ''فارسی-عربی حروفِ تہجی'' استعمال کیے جاتے تھے جب کہ دوسرا رسم الخط ''دیوناگری'' حروفِ تہجی سے مل کر بنا تھا۔ اس تحقیق کے سامنے آنے کے بعد برطانویوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ ذخیرۂ الفاظ کا فرق نہیں ہے بلکہ انھوں نے اس فرق کو محض رسم الخط کا فرق قرار دیا لیکن آج یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اردو اور ہندی زبانوں کے نہ صرف رسم الخط لامساوی ہیں بلکہ ذخیرۂ الفاظ کے حوالے سے بھی یہ دونوں زبانیں نمایاں لسانی ٹکراؤ رکھتی ہیں۔ اس لسانی تفریق کی ایک بڑی اور اہم وجہ ان زبانوں کے بولنے والے دو مختلف خطوں کے رہنے والے لوگوں کے درمیان مذہب کا فرق ہے۔ ایک زبان کے بولنے والے اسلامی تعلیمات کے پیروکار ہیں تو دوسری زبان بت پرستوں میں رائج ہے۔ لامساویت کا یہ پہلو لسانی ارتقا سے ختم نہیں ہو سکا بلکہ یہی فرق آگے چل کر ان دونوں زبانوں، یعنی اردو اور ہندی کی تہذیبی شناخت کا ضامن بنا۔ نیز انیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات نے بھی ان دونوں زبانوں کو دو مختلف تہذیبوں کی شناخت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں مذہب کو بنیاد بنا کر جن تحریکوں نے جنم لیا انھوں نے اپنی اپنی زبان کو شناختی علامت کے طور پر اپنا لیا یعنی اسلام کے پیروکاروں نے اردو کو جب کہ ہندی زبان بت پرستوں کی شناخت بن گئی۔ یہ پہلو توجہ طلب ہے کہ ان دونوں زبانوں نے کس کے اشارے پر اور کس طرح خود کو مذہبی شناخت کی علامت بنا لیا؟ اردو اور ہندی زبانوں کی بہ طور مذہبی علامت کے موضوع پر ہونے والی بے شمار تحقیقات کے باوجود اب تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں کی گئی بحث کا مقصد اردو اور ہندی زبانوں کا، بالخصوص اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں مذہبی علامت بننے کی ایک وجہ بیان کرنا ہے۔

''ہندوستانی'' اور ''اردو زبان'':

زبانوں کے نسلی حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو ہندی اور اردو زبانوں کا تعلق ''ہند-یورپیائی خاندان'' سے ہے۔ یہ نظریہ بھی مشہور ہے کہ ان دونوں زبانوں نے ''کھڑی بولی'' [2] کے خمیر سے جنم لیا جو دہلی شہر اور اس کے گرد و نواح میں بول چال کی عام زبان تھی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کے اس بنیادی پہلو کے مشترک ہونے کے باجود اس بات کی واضح تشریح موجود نہیں ہے کہ قواعد کے لحاظ سے ان زبانوں میں فرق کی ساخت اور نوعیت کیا ہے۔ اس فرق کی وضاحت ایک طرح سے یوں پیش کی جاتی ہے کہ

اگر کھڑی بولی کے الفاظ فارسی-عربی رسم الخط میں تحریر کیے جائیں تو وہ اردو زبان کے الفاظ کہلاتے ہیں اور اگر یہ الفاظ دیوناگری رسم الخط کا لبادہ اوڑھ لیں تو یہ ہندی زبان کہلائے گی۔ مذکورہ وضاحت انیسویں صدی میں برعظیم کے برطانوی حکمرانوں نے پیش کی۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں کی یہ وضاحت، برعظیم کے لیے برطانویوں کی مرتب کی گئی لسانی حکمتِ عملی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ مذکورہ بالا وضاحت جس دور میں پیش کی گئی، اس وقت دیوناگری رسم الخط کی اہمیت گھٹتی جارہی تھی جب کہ فارسی-عربی رسم الخط شمالی ہندوستان میں ادبا کے حلقے میں مقبولیت حاصل کرتا جارہا تھا۔ دیوناگری اور فارسی-عربی رسم الخط کے درمیان جاری اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلا کہ انیسویں صدی کا سورج غروب ہوتے ہی اردو زبان' ''ہندوستانی'' کے نام سے اپنی حیثیت قائم کرچکی تھی۔ پلیٹس کی مشہور لغت کے سرورق پر ''ہندوستانی یا اردو'' [۳] کے جگمگاتے الفاظ اس بات کا واضح ثبوت ہیں۔

اب ذرا اس نکتے پر بھی غور کرلیا جائے کہ ہندوستانی زبان کو برعظیم کی عوامی زبان کا درجہ دے کر اس کے قواعد مرتب کرنے کی ابتدا کب ہوئی۔ پھر یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ جب ہندوستانی زبان کے قواعد مرتب کیے گئے تو یہ زبان کیوں کر عوامی زبان کا درجہ پانے کے بعد دو مختلف زبانوں یعنی اردو اور ہندی میں تقسیم ہو گئی۔ ان نکات پر اب تک مختلف انداز سے تحقیق کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک تحقیق میں صرف برعظیم کے سیاسی اور سماجی حالات کو مدنظر رکھا گیا ہے اور بالخصوص اس پہلو پر تحقیق کی گئی ہے کہ انیسویں صدی میں برعظیم میں مذہبی بنیادوں پر قائم ہونے والی دو مختلف معاشرتوں میں یہ حالات کس نوعیت کے تھے؟ اس تحقیق میں حکومتِ انگلستان کے محفوظ کردہ ریکارڈ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا گیا ہے (براس، ۱۹۷۴ء؛ رابنسن، ۱۹۷۴ء؛ کنگ، ۱۹۹۴ء)۔ دوسری تحقیق میں برعظیم میں موجود ہندوستانی کے دو مختلف رسوم الخط کو مرکزِ تحقیق بنایا گیا ہے (قدوائی، ۱۹۷۲ء)۔ ایک اور تحقیق ان دونوں زبانوں کی لغات اور ذخیرۂ الفاظ پر بھی کی گئی ہے (دہلوی، ۱۹۰۱ء؛ رائے، ۱۹۸۴ء؛ عقیل، ۱۹۹۴ء)۔ [۴] زیرِ نظر مقالے میں میری تحقیق کا مقصد ان تمام زاویوں سے جدا ہے۔ میں نے ان دو زبانوں میں لامساویت کے اسباب کا سراغ لگانے کے لیے مشہور ماہر لسانیات، ڈاکٹر جان بارتھوک گل کرسٹ (۱۷۵۹ء-۱۸۴۱ء) [۵] کے وضع کردہ ان لسانی قواعد و ضوابط پر تحقیق کی ہے جسے انھوں نے خصوصی طور پر ''ہندوستانی'' زبان کے لیے مرتب کیا۔

ماہ و سال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کوئی ایسا ثبوت اب تک سامنے نہیں آسکا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ''ہندوستانی'' کا لفظ ایک زبان کے لیے کب سے استعمال ہونے لگا۔ مغل شہنشاہِ اوّل ظہیرالدین بابر کے ''بابر نامہ'' میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو ''ہندی'' کے نام سے پکارا گیا ہے۔

لہٰذا ''زبانِ ہندی'' کا مطلب اس لحاظ سے ''ہندوستان کے باشندوں کی زبان'' تو بنتا ہے لیکن جدید دور میں ''ہندی'' کا مطلب وہ نہیں ہے جو ''بابر نامہ'' کے مطالعہ سے اخذ کیا جاتا ہے (کونڈو، ۲۰۰۳ء، ص ۵۰۰)۔ مزید برآں لفظ ''ہندوستانی'' پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ لفظ ''ہندوستان'' کے آخر میں حرف ''ی'' کا اضافہ کر کے اسے ''ہندوستانی'' بنا دیا گیا اور یہ ایک زبان کا نام کہلایا جانے لگا لیکن انیسویں صدی سے قبل ہمیں برعظیم کے شعرا کے دیوانوں میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں ''ہندوستان'' کے لفظ کے آخر میں ''ی'' لگا دیا گیا ہو یا پھر لفظ ''ہندوستانی'' کو زبان کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہو۔ لہٰذا یہ بات کسی حد تک درست نظر آتی ہے کہ ہندوستانی کا لفظ بہ طور زبان، سب سے پہلے یورپ سے آئے ہوئے لوگوں نے ہی استعمال کیا (جین و دیگر)، ۱۹۹۸ء، ص ۴۹) تاہم اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت اب تک سامنے نہیں آسکا ہے۔[6]

اٹھارویں صدی کے وسط میں جن یورپی اقوام نے ہندوستان کے خطے کا مطالعہ کیا، انھوں نے ہندوستان میں بولی جانے والی زبان کو مختلف نام دیے۔ کسی نے اسے ''زبانِ اندوستان'' کہا تو کسی نے ''اندوستانی''۔ کوئی اسے ''زبانِ ہندوستان'' کہتا تو کوئی ''ہندس تانی'' پکارتا۔ اسے صرف ''ہندوستانی'' بھی کہا گیا۔ یوں اس زبان کو کئی ناموں سے پکارا گیا۔[7] چوں کہ فارسی زبان کے لفظ ''ہندو'' کے ساتھ ''ستان'' منسلک ہو کر ''ہندوستان'' بن گیا اور ''ستان'' کا مطلب ہے ''سرزمیں یا علاقہ''۔ لہٰذا لفظ ''ہندوستان'' اس علاقے کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے جو بنارس اور ستلج کے درمیان واقع ہے اور آگے جا کر دریائے سندھ سے جا ملتا ہے۔[8] برعظیم کی اس زبان کو جب مسلمان استعمال کرتے تو بعض یورپی لوگ اس زبان کا رشتہ ''مور'' سے جوڑ دیتے اور جب یہاں کے ہندو یہ بولی بولتے تو اسے ''جنتو'' سے منسلک کر دیا جاتا تھا۔[9]

محض فارسی لفظ ''ہندو'' کے استعمال سے وہ علاقہ ظاہر نہیں ہوتا ہے جو مکمل طور پر برعظیم اور دوآب کے علاقے پر مشتمل ہے۔[10] اس کے بجائے لفظ ''ہندوستان'' مکمل طور پر برعظیم اور گنگا و جمنا کے درمیان دوآب کے علاقے کی نشاندہی کرتا ہے لیکن درج ذیل اقتباسات سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز کی محفوظ کردہ برطانوی دستاویزات میں ''ہندوستان'' کا لفظ پورے برعظیم کے بجائے صرف شمالی ہند کے لیے استعمال ہوا ہے:

> ''اس منصفانہ، عقل مندانہ اور متوازن پالیسی پر مربوط نظام سے حاصل ہونے والے ان خوش آئند نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان اور دکن کے وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے علاقے برطانیہ عظمیٰ کی عمل داری میں شامل کیے گئے ہیں اور ان علاقوں کا نظامِ حکومت چلانے کے لیے انگلستان کی معزز 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کو اختیار دیا گیا ہے۔''[11] ("CFW"، ص ۲۳)

''ہندوستان کے بالائی علاقوں کی جدید اور ترقی یافتہ زبان کے ضمن میں مجھے جناب گل کرسٹ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت مسرت ہو رہی ہے جن کی ان تھک محنت نے ایک ایسی شائستہ زبان کے علم کا حصول آسان بنایا جو ہندوستان اور دکن کے چپے چپے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ اس زبان کی فی الوقت ادبی حیثیت نہیں ہے لیکن برعظیم کے باشندوں کے ہر تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقے میں یہ زبان' بول چال کی عوامی گفتگو کے لیے ایک مشترکہ بولی کی حیثیت رکھتی ہے۔ برعظیم کے ہر گاؤں میں کچھ ایسے باشندے ضرور موجود ہیں جن کے لیے یہ بولی قابلِ فہم ہے۔
("SEH"، ص۱۵)[۱۲]

مذکورہ بالا اقتباسات کی دستاویزات میں ہندوستان اور دکن کے الفاظ علیحدہ علیحدہ طور پر استعمال کیے گئے ہیں، جب کہ پورے برعظیم کے لیے، جس میں ہندوستان اور دکن بھی شامل ہیں ''ہندوستان'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے بہ ظاہر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ برعظیم کے برطانوی دورِ حکومت میں تمام سرکاری اور تعلیمی دستاویزات میں صرف شمالی ہندوستان کے علاقے کو ''ہندوستان'' لکھا اور پکارا جاتا تھا۔ لہٰذا منطقی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ صرف دوآب کے علاقے کی عوامی زبان کو ہی ''ہندوستانی'' کہا جاتا تھا، لیکن چوں کہ ہندوستان کا لفظ کئی مرتبہ پورے خطۂ ہند کے لیے بھی استعمال کیا گیا لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ پورے برعظیم میں خطے کی ایک مشترکہ زبان کا خیال پیدا ہونے لگا اور اس مشترکہ زبان کو ''ہندوستانی'' کا نام دے دیا گیا (فیوجی، ۲۰۰۲ء، ص۶۹)۔[۱۳]

علاقہ ''اُردو'' کی زبان: دربارِ شاہی میں مستعمل ایک شائستہ اور مہذب بولی

مذکورہ بالا بحث سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو لفظ ''اردو'' ترکی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی موجود ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں دہلی کی شہری حدود میں ''اردو'' نامی ایک علاقہ بھی موجود تھا جسے فوجی چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ چھاؤنی شاہ جہان آباد کے قریب ہی بنائی گئی تھی اور دیگر آبادیوں کے مقابلے میں یہ زیادہ ترقی یافتہ اور پوش آبادی تھی۔ اس چھاؤنی میں بول چال کی زبان کا نام ''زبانِ اردوئے معلّٰی'' تھا۔ غور کیا جائے تو اس زبان کا یہ نام تین مختلف زبانوں کے الفاظ سے مل کر بنا ہے، جن میں فارسی کا لفظ ''زبان''، ترکی کا لفظ ''اردو'' جب کہ عربی کا لفظ ''معلّٰی'' شامل ہے۔ یہ تینوں الفاظ فارسی قواعد کے مطابق ''زیر'' کا اضافہ کر کے آپس میں منسلک ہو گئے ہیں (شیکل اور اسنیل، ۱۹۹۰ء، ص۶)۔ چوں کہ مذکورہ نظریہ کے مطابق ''اردو'' کسی زبان کا نہیں بلکہ ایک علاقے کا نام تھا، لہٰذا اس علاقے (فوجی چھاؤنی) میں بولی جانے والی زبان ''زبانِ اردو'' یا ''اردو کی زبان'' کہلاتی تھی' یعنی یہ اردو نامی علاقے کی زبان تھی۔[۱۴] ممکن ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس فوجی چھاؤنی میں بولی جانے والی اس زبان کو صرف ''اردو'' کہہ کر پکارا جانے لگا۔

ایک اور نظریہ یہ بھی ہے (چغتائی، ۱۹۶۶ء، ص ۳۳) کہ سب سے پہلے مائل دہلوی نے اپنی تحریروں میں ''اردو'' کا لفظ بہ طور زبان یا بولی کے معنوں میں استعمال کیا۔ ذیل میں ان کی اس تحریر کو حوالے کے طور پر شامل کیا گیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ تحریر ۱۷۶۲ء (بمطابق ۱۱۷۶ھ) کے آس پاس ہی لکھی گئی ہے۔[15] یہ اولین تحریری نسخہ ہے جس میں ''اردو'' کا لفظ ایک زبان یا بولی کے معنوں میں استعمال ہوا، نیز درج ذیل تحریر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ لفظ ''اردو'' سے قبل بول چال کی زبان کو ''ہندوی'' کہہ کر پکارا جاتا تھا:

بولا وہ شخص یہ تو کہانی میں سب سنی
اُردو کا ... بتا دے مسلسل کھلا کھلا
مشہورِ خلق اردو کا تھا ہندوی لقب
اگلے سفینوں بیچ یہ لکھ گئے ہیں سب للا
شاہِ جہاں[16] کے عہد سے خلقت کے بیچ میں
ہندوی تو نام مٹ گیا اردو لقب چلا

مائل کے بعد دہلی شہر سے تعلق رکھنے والے مصحفی نے اپنے مشہور شعر میں ''اردو'' کا لفظ بہ معنی زبان یوں استعمال کیا:

خدا رکھے ، زبان ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم ، اے مصحفی اردو ہماری ہے

(جبین (دیگر)، ۱۹۹۸ء، ص ۵۵)[17]

اردو کے الفاظ جن خوب صورت آوازوں اور سُروں کو تخلیق کرتے ہیں، ان کی مثال دہلی کے نامور شعرا میر اور سودا کے کلام میں بہ خوبی ملتی ہے۔ مصحفی نے ان خوب صورت سُروں کی تعریف کرتے ہوئے اپنے کلام کا موازنہ میر و سودا کے کلام سے کیا اور اپنی شاگردی کا اعتراف کیا۔

اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اردو شاعری کے متعلق یہی قیاس عام ہے کہ اس کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ پھر ولی دکنی نے اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں شعرائے دہلی کے حلقوں میں اردو شاعری کی رونمائی کی۔ یہ زبان پہلے پہل دہلی میں ''ریختہ'' کے نام سے پکاری جاتی رہی لیکن جلد ہی اس نے ترقی کے منازل طے کیے اور پھر ایسا وقت بھی آیا کہ اس زبان نے فارسی کی جگہ لے لی، اور پھر اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک دہلی کے شعرا نے اسے لسانی حیثیت کا درجہ دے کر بہ طور زبان اس کا استعمال کرنا شروع کر دیا، جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں میں بیان کیا گیا ہے۔ گویا ''اردو'' کا نام ایک زبان کو بھی دے دیا گیا اور یہی لفظ ایک فوجی چھاؤنی کے علاقے کا نام بھی تھا۔ اس مقام پر اگر ''ہندوستانی'' کا ذکر کیا جائے تو اٹھارویں صدی عیسوی

کے اردو شعرا کے کلام میں لفظ ''ہندوستانی'' مشکل ہی سے ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

فورٹ ولیم کالج اور ہندوستانی پریس، اٹھارویں صدی عیسوی کے دو معروف نام ہیں۔ ۱۸۰۳ء میں کلکتہ میں واقع فورٹ ولیم کالج کی ہندوستانی پریس نے ''قصہ چہار درویش، یا باغ و بہار'' شایع کی۔ اس تصنیف کو اردو زبان کے اولین اور جدید اردو نثر کا درجہ حاصل ہے جسے میر امن دہلوی نے تحریر کیا۔ وہ اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''جناب جان گل کرسٹ نے مجھے حکم دیا کہ اس قصے کو ہندوستانی بولی (ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو) میں ترجمہ کروں کہ جسے اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں..... میں اردو زبان (' اردو' کی زبان) کی ترقی کے متعلق سن چکا تھا۔'' [۱۸]

میر امن نے ایک علاقے کو ''اردو'' کے نام سے پکارا جہاں ''ہندوستانی بولی'' سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ میر امن کی اس تصنیف کا ''پیش لفظ'' اردو زبان کے متعلق گل کرسٹ اور مصحفی کے نظریات کے مماثل ہے اور انھی کی عکاسی کرتا ہے۔

''باغ و بہار'' چار قصوں پر مشتمل ہے۔ اس قصے کی اولین اشاعت ۱۸۰۱ء میں ایک کتابچہ میں ہوئی تھی جس کا عنوان تھا: "The Hindee Manual or Casket of India"۔ ۱۸۰۳ء میں جب اس قصے کی دوبارہ اشاعت ہوئی تو پہلے ایڈیشن اور ۱۸۰۳ء کے اس نئے ایڈیشن میں قصے میں بیان کردہ ضرب الامثال میں نمایاں فرق موجود تھا (خان، ۱۹۲۲ء، ص ۱۰۵)۔ [۱۹] اس نئے ایڈیشن میں گل کرسٹ کے حکم پر نثری اسلوب کو عوامی گفتگو اور اس وقت کے معاشرے میں رائج ضرب الامثال کے مطابق مزید ترتیب میں لایا گیا تھا۔ گل کرسٹ کی باریک بین نگاہوں اور ان کی نثری ترتیب میں بہتری لانے کی خواہش نے بالآخر ہندوستان کو ایک ایسے نثری شاہکار کا تحفہ دیا جو خالصتاً ہندوستان کے عوامی اسلوب کی نمائندگی کرتا تھا۔

گل کرسٹ ہمیشہ لفظ ''اردو'' کو انگریزی میں "Oordo" (اردو تلفظ: ''اوردو'') لکھا اور بولا کرتے تھے۔ وہ اسے ''نکھری ہوئی زبان'' (Polished Language) کہا کرتے تھے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اردو واقعی گلی کوچوں میں بسی ہوئی بولی تھی جسے اب ہندوستان میں رگڑ رگڑ کر چمکا دیا گیا تھا۔ گل کرسٹ کے اس نظریہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان دراصل ایک مختلف و منفرد لہجے اور مخصوص جذبات و تاثرات کی حامل عوامی گفتگو کے لیے استعمال ہونے والی محض ایک بولی تھی اور اسے کبھی بھی ایک خود مختار اور آزاد زبان کی حیثیت حاصل نہیں رہی۔ گل کرسٹ نے ایک مقام پر لکھا کہ:

''عام طور سے ہندو اور نچلے طبقے کے مسلمان اسے خلط ملط کر دیے، جس طرح انھوں نے کچھ حرفوں

کے ساتھ کیا مثلاً 'ف' (فا)، 'ش' (شا)، 'ز' (زا)، 'ظ' (ظا)، 'پ' (پا)، 'پھ' (پھا)، 'ٹ' (ٹا) اور 'ڑ' (ڑا) وغیرہ۔'' ("OL"، ص ۱۲)[20]

ایک اور مقام پر گل کرسٹ نے لکھا کہ:

''الفاظ کی ادائیگی تلفظ میں بھی فرق ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔'' ("SEH"، ص ۱۷)[21]

اس کا مطلب ہوا کہ اعلیٰ طبقے کے مسلمان جو اردو نامی علاقے میں رہتے تھے، انگریزی حروف مثلاً الیف (f)، زیڈ (z) وغیرہ میں فرق کو ملحوظ رکھ سکتے تھے اور انھیں درست طور سے تلفظ کر سکتے تھے۔ اس فرق کو اس سے قبل صرف عربی یا فارسی کے اہل زبان ہی سمجھ سکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمان اور ہندو جو مغلیہ دورِ شہنشاہیت میں فارسی تہذیب وتمدن سے ناواقف تھے، یورپی زبان کے الفاظ کو درست طریقے سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس مقام پر یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ ادائیگی الفاظ کا یہی فرق ان بنیادی وجوہات میں سے ایک تھا جس کے سبب اردو زبان، ایک عام بول چال کی زبان کی صف سے نکل کر ایک صاف ستھری، نفیس اور شائستہ زبان کی حیثیت سے اپنی لسانی عمارت کھڑی کرنے میں کام یاب ہوسکی۔

انشا نے اردو قواعد سمجھانے کی غرض سے فارسی زبان بھی استعمال کی جس کی مثال ان کی کتاب ''دریائے لطافت'' (۱۸۰۸ء) ہے۔[22] اس کتاب میں انشا نے اردو زبان کا تعارف ''شاہ جہان آباد کی زبان'' کے طور پر کروایا (انشا، ۱۹۳۵ء، ص ۱۲۱) اور لکھا کہ اپنی خصوصیات کے حوالے سے یہ زبان نہایت صاف ستھری (فصیح) تھی جسے نہایت سلجھے ہوئے لوگ (فصحا) ہی بولتے تھے اور وہ بھی نہایت شائستگی اور روانی سے (انشا، ۱۹۳۵ء، ص ۳۵-۳۸، ص ۱۲۰-۱۲۵)۔[23] انھوں نے وضاحت سے اس بات کو بیان کیا ہے کہ اردو زبان کس علاقے میں مستعمل تھی۔ یہ علاقہ، ضلع کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی حدود میں دہلی کا قلعہ اور شہری آبادی والے دو علاقے شامل تھے۔ یہ ضلع، سید فیروز کی حویلی سے شروع ہوتا تھا اور ملکہ کے محل پر جا کر ختم ہوتا تھا جس کے درمیان اسمٰعیل خان کی حویلی قائم تھی (انشا، ۱۹۳۵ء، ص ۳۶)۔[24] اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ''اردو'' دراصل ایک رہائشی علاقہ تھا جو دہلی کے قلعے کے قرب وجوار میں موجود تھا۔ نیز انشا نے ان الفاظ ومحاورات کی ایک فہرست بھی بنائی جنھیں نامانوس سمجھا جاتا تھا اور جنھیں اردو نامی علاقے کے لوگ استعمال کیا کرتے تھے۔[25] یہ امر نہایت دل چسپ ہے کہ یہ نامانوس الفاظ ومحاورات فارسی زبان کے نہیں تھے بلکہ برعظیم ہی کے دیسی ذخیرۂ الفاظ پر مشتمل تھے (انشا، ۱۹۳۵ء، ص ۱۲۵-۱۶۸)۔ انشا کی بیان کردہ اس وضاحت سے ہم بہ خوبی اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ قواعد کے لحاظ سے اگرچہ اردو زبان، شمالی ہند کی دیگر بولیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی البتہ گفتگو کے دوران اگر کوئی شخص اردو بولتا تو اس کی بولی کے انداز میں ایک واضح فرق محسوس کیا

جاسکتا تھا۔[۲۶] ''باغ و بہار'' اسی انداز و اسلوب کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی تھی اور اسی سبب اسے برعظیم ہند کی سلیس اور صاف ستھری زبان کی ایک نثری مثال کا درجہ حاصل ہے، نیز اس کے لفظ و تان کے عام فہم نہ ہونے کی بہ ظاہر یہی وجہ نظر آتی ہے کہ اس زبان نے عربی اور فارسی، دونوں زبانوں کے طرائق تلفظ کو اپنا لیا تھا۔

مندرجہ بالا بحث سے درج ذیل یہی نتیجہ نکلتا ہے جو گل کرسٹ نے اخذ کیا۔ اگرچہ انھوں نے ہندوستانی زبان کو ہندی، اردو یا ریختہ کے ناموں سے بھی پکارا لیکن ساتھ ہی اس زبان کی علاقائی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ: ''(یہ) شاہی دربار اور شاہی علاقوں میں مستعمل زبان (تھی)۔'' ("SEH"، ص ۱۶)

گل کرسٹ نے اس بات کو واضح کیا تھا کہ:

''لغوی اعتبار سے ہندوستان ایک مرکب لفظ ہے جو 'ہندو کی سرزمین' یا 'سیاہ فاموں کی سرزمین' کا ہم معنی ہے۔ اس خطے کے متعلق ہر نوعیت کی معلومات موجود ہیں، لہٰذا یہ ایک جانا پہچانا خطہ ہے۔ ہندو اور مسلمان یہاں پر آباد دو بڑی قومیں ہیں۔'' ("OL"، ص ۳)

اس نے مزید لکھا کہ:

''اس زبان کے لیے صرف 'ہندوستانی' ہی ایسی اصطلاح ہے جو تمام تر معنویت کی حامل ہے جسے میں نے مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر استعمال کیا ہے۔ کچھ دیگر وجوہات کا بھی ذیل میں ذکر کرتا چلوں۔ اس ملک کا یہ نام کافی جدید لگتا ہے اور ساتھ ہی یہاں کی مقامی زبان بھی اہمیت کی حامل ہے۔ پہلے پہل جب میں کاشت کاری اور مطالعہ میں مصروف تھا تو اس زبان کے علاوہ کوئی اور مقامی زبان مجھے لسانی اعتبار سے موزوں معلوم نہیں ہوئی۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں کے باشندوں اور دیگر لوگوں نے اس زبان کو ہندوستان کے قدیم نام 'ہند' کی نسبت سے 'ہندی' یا 'انڈین' بھی کہا ہے، لیکن جب اسے لفظ 'ہندو' سے اخذ کردہ اصطلاحات مثلاً ہندوی، ہندوئی، یا ہندوی سے مناسبت دی جاتی ہے، تو میں اپنے اس نظریہ پر قائم ہو جاتا ہوں کہ ہمیں اس ملک کی اس مقبول بولی کے متعلق دیگر عرفیات اور ان کے استعمال کو ترک کرنا ہوگا جن میں 'مور' کا بے معنی لفظ اور 'ہندوستانی' کے لیے متبادل الفاظ شامل ہیں، چاہے یہاں کے باشندے اسے استعمال کرتے رہیں یا نہ کرتے رہیں، کیوں کہ یہاں کے لوگ توجہ دلانے کے باوجود ان پابندیوں کے استعمال اور ان کی مناسبت و معقولیت کے مشاہدے میں مشکل ہی سے مناسب طور پر تفریق کر پاتے ہیں۔ میرے نزدیک 'ہندوی' زبان صرف ہندوؤں کی لسانی میراث ہے اور اسی لیے اسے ہندوستان کی قدیم زبان کے ضمن میں بیان کیا جاتا ہے جو برعظیم میں مسلمانوں کی یلغار سے قبل رائج تھی۔ در حقیقت دورِ حاضر میں ان لوگوں کے درمیان ابھی ہندوستانی زبان ہی اپنی بنیادی اور ابتدائی شکل میں رائج ہے جو نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ حالت میں دو مختلف زبانوں، عربی اور فارسی کے ذخیرۂ الفاظ پر

مشتمل دورِ حاضر میں موجود ہے' نیز یہ دونوں زبانیں اسی حیثیت کی حامل سمجھی جاسکتی ہیں جو حیثیت انگریزی زبان کے ضمن میں لاطینی اور فرانسیسی زبانوں کو حاصل ہے۔'' ("OL"، ص۳)

گل کرسٹ نے برعظیم کی مشترکہ اور عوامی زبان کے نام کے لیے لفظ ''ہندوستانی'' کا انتخاب کیا کیوں کہ اگر ہم اس زبان کے لیے ''ہندوستان'' یا ''ہند'' سے اخذ کردہ الفاظ مثلاً ''ہندی'' یا ''انڈین'' استعمال کریں تو یہ الفاظ اس وقت الجھن پیدا کرتے ہیں جب ہم ''ہندوِی''، ''ہندووِی'' یا ''ہندوئی'' کے الفاظ پڑھتے ہیں جو دراصل لفظ ''ہندوٗ'' سے اخذ کیے گئے ہیں ("OL"، ص ۳)' نہ کے ''ہند'' سے۔ گل کرسٹ کے بعد ان کے جانشین' تھامس روبک نے ''اردو'' کی تعریف یوں بیان کی:

''صاف ستھری اور شائستہ زبان' جسے 'اردو' (Oordoo) کے نام سے پکارا جاتا ہے' یا پھر ہندوستان کے دربارِ شاہی کی بولی کے نام سے۔'' ("ACF"، ص۴۴۸)

یہ بات اب تک واضح نہیں ہوسکی ہے کہ لفظ ''ہندوستان'' توضیعی تھا یا اسے یورپ سے آئے ہوئے لوگوں نے استعمال کیا' لیکن یہ قطعیت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ گل کرسٹ نے برعظیم کی عام بول چال کی زبان کو ایک نیا نام' ''ہندوستانی'' دیا۔ داس نے لکھا ہے کہ:

''یہ بات تو بہرحال واضح نہیں ہوسکی ہے کہ گل کرسٹ نے سیدھی طرح اس زبان کو جس کی انھوں نے تدریس کی' 'اردو' کا نام کیوں نہیں دیا۔ صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ اپنے عہد میں ایک نیا اسلوب ایجاد کرنا چاہتے ہوں جس سے فارسی کی چھاپ چڑھی 'اردو زبان' اور گلی کوچوں میں پڑی 'کھڑی بولی' کے درمیان کی کوئی راہ نکل سکے۔'' (داس، ۱۹۷۸ء، ص۴۴)

اس نظریہ کی حمایت کرتے ہوئے میں مزید کچھ اپنی رائے اس میں شامل کرنا چاہوں گا۔ ممکن ہے کہ گل کرسٹ کا نقطۂ نظر یہ ہو کہ برعظیم کی عوامی زبان کا نام کچھ ایسا رکھا جائے جو لفظ ''ہندی'' (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے ساتھ استعمال ہونے پر الجھن نہ پیدا کردے، یعنی گل کرسٹ اس الجھن کے پیدا ہونے سے گریز کرنا چاہتے تھے اور یہ بات بھی خارج از امکان نہیں کہ اگر وہ اس زبان کے لیے ''اردو'' کا لفظ استعمال کرتے تو یہ لفظ علاقائی پابندیوں کی قید میں آجاتا۔ ممکن ہے کہ اسی علاقائی پابندی کی صورت حال پیدا ہونے سے بچنے کے لیے گل کرسٹ نے اس زبان کو ''اردو'' کا نام نہیں دیا کیوں کہ یہ اس دور کی بات ہے جب کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں اس زبان کے قواعد اور پورے ہندوستان میں روزمرہ کے معاملات میں اس کے طریقۂ استعمال کی تدریس کی جارہی تھی۔ اس دور میں کلکتہ شہر، ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور برعظیم کی دیگر دیسی بولیوں کی تدریس کے لیے یقیناً ایک ایسی زبان کا ہونا بہت ضروری تھا جسے برعظیم کے شمالی خطے میں، جسے انگریز ''ہندوستان'' کہا کرتے تھے، باآسانی سمجھا جاسکے۔ اسی لیے گل کرسٹ نے اس

زبان کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اسے ''ہندوستانی'' کا نام دینا چاہتے تھے۔[۲۷]

اس اہم نکتے کا ذکر بھی بہت ضروری ہے کہ مذکورہ بالا دور میں فارسی کے بجائے برعظیم کی اسی عوامی زبان کا علم حاصل کرنا برطانویوں کی ضرورت بن گیا تھا جس کی مدد سے وہ عوامی سطح پر آ کر برعظیم کے باشندوں کے ساتھ باہمی تعلقات قائم کر سکتے تھے۔[۲۸] یہ برطانویوں کے لیے بہت اہم زبان تھی اور اسی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی، برطانوی افسران کو ایک مخصوص رقم بہ طور وظیفہ منشی (مترجم) ادا کرتی تھی تا کہ ان میں برعظیم کی اس دیسی بولی کے علم کے حصول کا شوق پیدا ہو (باون، ۱۹۵۵ء، ص ۸)۔ لہٰذا کمپنی کے انتظامی اور تجارتی امور کی انجام دہی کے لیے اب فارسی زبان کے بجائے اسی دیسی بولی کے علم اور اس کے حصول کی اہمیت کا نظریہ جڑ پکڑتا گیا۔ DNB کے صفحہ ۱۲۲۱ پر یہی نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ''گل کرسٹ نے اس زبان کے علم کی تحصیل میں جو کامیابیاں حاصل کیں، ان کام یابیوں نے کمپنی کے ملازمین میں ایک نئی روح پھونک دی اور یوں ہندوستانی زبان کی تعلیم مقبول سے مقبول تر ہوتی چلی گئی''۔

مغلیہ شاہی دربار میں چوں کہ فارسی زبان کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل تھی، لہٰذا یہ امر فطری ہے کہ جب اس درباری زبان ''اردو'' میں فارسی کے الفاظ و تراکیب اور فارسی کی آواز شامل ہوئیں تو اس درباری زبان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا اور ہندوستان کی صاف ستھری اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے اس کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ یہاں پر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو اور ہندوستانی دراصل ایک ہی زبان کے دو نام ہیں کیوں کہ برطانویوں کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اسلوب کے لحاظ سے ہندوستانی زبان کی مزید ترقی یافتہ شکل، اردو زبان کہلائی۔ مزید برآں لفظ ''ہندوستانی'' میں بہر حال ابہام موجود تھا کیوں کہ معنوی اعتبار سے اسے شمالی ہند کی زبان بھی ہونا چاہیے اور پورے ہند کی بھی۔ اسی وجہ سے اردو کی لسانی حیثیت میں کئی ارتقائی مراحل آتے رہے۔ پہلے پہل یہ ''دربارِ شاہی کی صاف ستھری اور شائستہ زبان'' کہلائی۔ پھر اسے ''شمالی ہند کی عوامی زبان'' کا درجہ ملا اور پھر آخر کار یہ ''برعظیم ہند کی زبان'' قرار پائی۔ گل کرسٹ جس زبان کی تدریس فورٹ ولیم کالج میں کیا کرتے تھے، اسے ''ہندوستانی'' کہا کرتے تھے۔[۲۹] اگرچہ ان کے دور میں بھی اور ۱۸۰۴ء میں ان کے واپس برطانیہ چلے جانے کے بعد بھی اردو اور ہندوستانی، ایک ہی زبان سمجھی جاتی رہی (داس، ۱۹۷۸ء، ص ۴۳)۔ ایک لمحے کے لیے میں آپ کی توجہ میر حسن کی تصنیف ''سحر البیان'' کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا جو گل کرسٹ کی برطانیہ واپسی کے اگلے ہی سال ۱۸۰۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں واضح طور سے تحریر ہے کہ اس کتاب کا متن جس زبان میں تحریر کیا گیا ہے وہ ''ہندوستانی'' زبان ہے (حسن، ۱۸۰۵ء)[۳۰] لیکن ''سحر البیان'' کی اشاعت کے چھ سال بعد ۱۸۱۱ء

میں شائع ہونے والی میر تقی میر کی "کلیاتِ میر" میں اس زبان کا نام "اردو" لکھا گیا۔ "کلیاتِ میر" کے سرورق پر یہ عبارت تحریر کی گئی تھی:

"Kooliyat Meer Tuqee, The Poems of Meer Mohummad Tuqee, The Whole of His Numerous Compositions in the Oordoo,or Polished Language of Hindoostan." (میر،۱۸۱۱ء)[۳۱]

یعنی "کلیات میر، میر محمد تقی کی غزلیات، اُردو یا ہندوستان کی نفیس زبان میں ان کی کثیر تراکیب کا مجموعہ"۔

فورٹ ولیم کالج میں لسانی تعلیم وتدریس شامل کرنے کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ایک ایسی زبان کی تعلیم دی جائے جو ہندوستان میں قائم ہونے والی برطانوی عمل داری کی مقامی زبان بھی ہو اور تمام طبقوں کی مشترکہ بھی ہو، کیوں کہ برطانوی افسران کی مناسب تربیت کی تکمیل کے بعد یا تو انھیں ملک کے اندرونی علاقوں میں تعینات کر دیا جاتا یا پھر انھیں مختلف صدارتی دفاتر میں کوئی منصب عطا کیا جاتا۔" (CFW، ص۹)

اس نکتے پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ انشا نے "دریائے لطافت" میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے وسط میں نادر شاہ اور احمد شاہ کی دہلی پر یلغار کی وجہ سے دہلی کے وہ افراد جن کی گفتگو میں سلاست اور روانی تھی (یعنی فصحا) جیسے ادبا، فن کار اور گلوکار حضرات وغیرہ، مرکز سے ہجرت کر کے لکھنؤ کے مشرقی خطے کے مختلف شہروں میں جا بسے۔ انشا نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ دہلی سے ہجرت کرنے والے کئی لوگ ان مشرقی شہروں میں رہتے ہوئے بھی وہاں کے لہجے میں گفتگو کرنے سے گریز کیا کرتے تھے اور اسی طریقے سے گفتگو کرتے تھے جو خاص دہلی والوں کا طریقہ تھا۔ انشا کی وضاحت اس نکتے پر از سرِ نو سوچنے اور تحقیق کرنے کی دعوت دیتی ہے کہ اردو زبان کیوں کر دور دراز علاقوں تک پھیل گئی اور شمالی ہند کے ایک وسیع رقبے پر کیوں کر اس زبان کو بآسانی سمجھا جا سکتا تھا (انشا، ۱۹۳۵ء، ص۱۱۳-۱۲۵)۔

ہندوستانی (بہ طور عوامی زبان) کے بیانیہ قواعد

فورٹ ولیم کالج کا قیام:

اٹھارویں صدی کے آخر تک تو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی صرف فارسی زبان کی تعلیم وتدریس میں ہی دل چسپی رکھتی تھی کیوں کہ مغلیہ دورِ ہندوستان میں یہی زبان دانش وروں کے حلقے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ ۱۷۸۴ء میں ولیم جانس نے "ایشیاٹک سوسائٹی" قائم کی اور اس سوسائٹی کے ممبران نے پہلے پہل تو کلاسیکی زبانوں مثلاً عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم وتدریس پر خصوصی توجہ دی، لیکن ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی میں انگریزوں کی فتح کے بعد برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط پورے ہندوستان پر قائم ہونے لگا تھا اور اس

کمپنی کی حیثیت ایک تجارتی ٹولے کے بجائے ایک غیر ملکی فاتح گروہ کی سی ہوگئی تھی۔ گزشتہ سطور میں تذکرہ کیا گیا کہ کمپنی کے ایوانوں میں اس بات کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی کہ چوں کہ خطے کے سیاسی و معاشی حالات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں، لہٰذا یہاں کی دیسی اور علاقائی بولیوں کا علم جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس وقت جارج ہیڈلے کی کتاب اور اس جیسی چند ہی کتابیں موجود تھیں جن میں ہندوستانی زبان کے قواعد سمجھائے گئے تھے (صدیقی، ۱۹۶۰ء، ص ۳۹)۔ اگرچہ قواعد کی رو سے ہیڈلے کی کتاب اغلاط سے بھری پڑی تھی [۳۲] لیکن کم از کم یہ کتاب اس لائق تھی کہ اس سے ہندوستانی زبان اور اس کے قواعد کے متعلق تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو سکیں۔ اس کتاب میں عملی مثالیں بھی موجود تھیں اور آسان بول چال میں مدد کے لیے الفاظ و محاورات کی ایک فہرست بھی دی گئی تھی۔ اس لحاظ سے ہم اس کتاب کو قواعد کی کتاب تو نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ مکالماتی خصوصیات رکھنے والی ایک کتاب تھی جو بول چال میں معاون ثابت ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی کیوں کہ قیمتاً یہ نہایت سستی کتاب تھی۔

ہیڈلے کی اس کتاب کی طرز پر ہندوستانی زبان کے قواعد کے متعلق جو دیگر کتب دستیاب تھیں، وہ بھی انگریزی زبان میں ہی شایع کی گئی تھیں اور اسلوب کے اعتبار سے محض مکالماتی کتب ہی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ اس وقت ہندوستانی زبان کے قواعد کا علم جاننا اس قدر اہمیت کا حامل نہیں سمجھا گیا بلکہ صرف وہ کتب اہمیت کی حامل ہوا کرتی تھیں جن میں ہندوستانی بول چال کی عملی مثالیں موجود ہوتی تھیں۔ نیز ان کتب کے مصنفین یا تو طب کے شعبے سے وابستہ ڈاکٹر حضرات ہوتے تھے یا پھر فوج سے وابستہ عسکری افسران۔ اس کی بہترین مثال خود ہیڈلے کی ذات ہے۔ وہ بھی اس زبان کا صرف اسی قدر علم جانتے تھے جتنا زندگی کے تجربوں نے انھیں سکھایا تھا۔ اس پس منظر میں صرف گل کرسٹ ہی ہندوستان کی اس دیسی زبان کے قواعد کے ماہر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ ۱۷۹۸ء میں ولزلی نے ہندوستانی زبان کے ماہر کے طور پر گل کرسٹ کا ہی انتخاب کیا۔ ولزلی کے خیال کے مطابق ''(ان لوگوں نے) عملے کی توجہ ان مشرقی ایشیائی ماہرین کی جانب مبذول کروائی جو بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی اور سر ولیم جانس کے کام کو آگے بڑھا رہے تھے، بالخصوص نیل ایڈمن سٹون، جان گل کرسٹ، ہنری کال بروک اور ولیم کیرے جو سیرام پور (مغربی بنگال کے ضلع ہگلی کا ایک شہر) کے مبلغ تھے'' ("EIC"، ص ۶)۔ ولزلی کی ہدایت پر ۱۷۹۹ء میں کلکتہ میں اورینٹل سیمیناری کا قیام عمل میں آیا جہاں فارسی اور ہندوستانی زبانوں کی تعلیم و تدریس کی جاتی تھی۔ اس درسگاہ کا نام "Mr. Gilchrist's Seminary" (گل کرسٹ سیمیناری) رکھا گیا تھا ("CFB"، ص ۸۲) اور پھر بالآخر ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ [۳۳]

کلکتہ میں واقع رائٹرز بلڈنگ میں ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ کالج کے قیام کے وقت جنرل مارکوئس ولزلی نے اس بات پر زور دیا کہ دیسی زبانوں کی اس قدر معلومات ضرور ہونی چاہییں جس سے انھی زبانوں میں روزمرہ کے امور کی انجام دہی ممکن ہو سکے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے معاشرتی قوانین اور یہاں کی ثقافت کے متعلق معلومات ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اس لیے اس کا واحد طریقہ 'منظم انداز سے یہاں کی زبانوں کی تعلیم و تدریس ہی تھا ("CFW"، ص ۲۱-۲۲)۔

اس کالج میں ہندوستانی خطے کی کئی زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ محمڈن لاء (اسلامی قوانین)، ہندو لاء (ہندو قوانین)، اخلاقیات، شہری قانونیات اور قوانین اقوام کی تعلیم کا بھی مناسب بندوبست کیا گیا تھا ("CFW"، ص ۲۷)۔ عموماً سولہ سے اٹھارہ سال تک کی عمر کے طلبا اس کالج میں زیرِ تعلیم تھے ("CFW"، ص ۸)۔ طلبا کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ ایک ساتھ کئی زبانیں بھی پڑھ سکتے ہیں اور تمام زبانوں کا امتحان ان میں سے کسی ایک زبان میں دے سکتے ہیں، البتہ طلبا کی اکثریت کالج میں پڑھائی جانے والی زبانوں میں سے ہندوستانی زبان کا انتخاب کیا کرتی تھی۔[۳۴] جب کالج میں تعلیمی سلسلہ جاری ہوا تو ولزلی نے اعلان کیا کہ: ''آج کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول خدمت گاروں کو تجارتی نمائندوں کی حیثیت حاصل نہ ہوگی بلکہ اب انھیں درحقیقت ایک بااقتدار طاقت کے وزیروں اور افسروں کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے'' ("CFW"، ص ۵-۶)۔ کالج کی رپورٹ کے مطابق کالج کے قیام کا یہ مقصد تھا کہ: ''ان (برطانوی) نوجوانوں کی تربیت کرنا جو یہاں (ہندوستان) کے باشندوں پر حکومت کریں گے'' ("CFW"، ص ۱۵۵)۔ افسران کے لیے اس قسم کی تربیت اور دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کا منصوبہ دراصل پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی پالیسی کا حصہ تھا جسے گورنر جنرل ولزلی کے دور میں خوب ترقی ملی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان نوجوان افسران کی کردار سازی بھی بہت ضروری تھی۔ ہیڈلے کے مطابق ۱۷۶۳ء تک کلکتہ میں صرف تین غیر شادی شدہ برطانوی خواتین موجود تھیں لیکن جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا ویسے ویسے مشرق کے اس خطے میں بہتری اور فلاح کے دیگر کاموں کے ساتھ ساتھ رشتہ ازدواج سے منسلک ہونے کا سلسلہ بھی دھیرے دھیرے آگے بڑھنا شروع ہوا (ہیڈلے، ۱۷۹۶ء، ص ۱۷۵-۱۷۶)۔ چند نوعمر برطانوی مردوں نے ہندوستان کی مقامی خواتین سے بھی شادیاں کیں اور ان خواتین سے ان کی اولادیں بھی ہوئیں۔ اس نسل کو برطانوی قوم نے ''سوتیلی نسل'' یا ''یوریشیائی'' (یورپ اور ایشیا کا ملاپ) کا نام دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرتا دھرتاؤں کے لیے یہ حالات کافی پریشان کن تھے اور وہ انھیں گمراہی اور تباہی سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ سراسر بےشعوری اور کم عقلی تھی جس میں نوجوان برطانوی افسران مبتلا ہو گئے تھے ("EIC"، ص ۱۴-۱۶)۔ کمپنی کی

رپورٹ میں ان افسران اور مقامی افراد کے تعلقات کے متعلق لکھا گیا کہ: ''یہ (افسران) یہاں کے مقامی باشندوں سے بہت ہی کم روابط رکھتے ہیں۔ تقریباً سبھی افسران کی اس ملک (ہندوستان) کی زبان کے بارے میں معلومات اور لسانی مہارت انتہائی ناقص ہے'' ("CFW"، ص ۱۱)۔ رپورٹ میں یہی نتیجہ نکالا گیا کہ: ''یہ صورت حال نہ صرف شرمناک ہے بلکہ ریاستِ برطانیہ کے لیے انتہائی نقصان دہ بھی ہے'' ("CFW"، ص ۱۲)۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۷۹۳ء میں گورنر جنرل ولزلی کے حکم پر کمپنی میں ہندوستانی اور یوریشیائی لوگوں کو مستقل طور پر بھرتی کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی (سکہ، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲)۔ نیز کمپنی نے ''مناسب طریقے سے اپنے ملازمین کے اخلاق و اطوار کو بہتر بنانے'' کی ضرورت پر بھی زور دیا ("CFW"، ص ۲۳)۔ کارن ویلس کے بنائے گئے اس منصوبے کو چارلس گرانٹ (جو انجیل مقدس کا مبلغ بھی تھا اور کمپنی کا طاقتور ڈائریکٹر بھی) کی حمایت سے بہت تقویت ملی کہ ایسے معزز نوجوان تیار کیے جائیں جن کے اخلاق، عیسائیت کی تعلیمات کے عین مطابق تعمیر کیے گئے ہوں۔[۳۵] کالج کی حیثیت ''عیسائی مذہب کی تعلیمات کے مطابق تعمیر شدہ کالج'' قرار دی گئی اور اس کالج کے قیام کا مقصد صرف مشرقی زبانوں کی تعلیم دینا ہی نہیں ..... بلکہ ''عیسائی مذہب کو یہاں (ہندوستان میں) قائم کرنا اور اس خطے میں اس کی پشت پناہی کرنا'' بھی تھا ("CFW"، ص ۴۶)۔ اساتذہ کو باقاعدہ حلف لینا پڑتا کہ: ''میں دل و جان سے حلفیہ اقرار کرتا ہوں اور اعلانیہ عہد کرتا ہوں کہ میں انفاً اور ظاہراً دونوں طور سے کسی بھی ایسے نظریہ یا عقیدہ کی تبلیغ سے گریز کروں گا جو عیسائی مذہب کے متصادم ہو'' ("CFW"، ص ۴۷)۔ نیز یہ بھی قانون تھا کہ ''کالج کا سربراہ ہمیشہ چرچ آف انگلینڈ کا پادری ہی ہوگا'' ("CFW"، ص ۲۶)۔[۳۶]

یوں دیسی زبانوں کی تعلیم کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی اور اس وجہ سے دیسی زبانوں کی تعلیمی درس گاہوں کی اہمیت بھی بڑھنے لگی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد بمبئی (موجودہ ''ممبئی''، ہندوستان) اور مدراس (موجودہ ''چنائے'' ہندوستان) میں بھی اسی طرز کی تعلیمی درس گاہوں کا قیام عمل میں آنے لگا۔ ہندوستان میں قائم ہونے والی اس طرز کی تمام درس گاہوں میں عموماً امتحانات کے لیے ایک ہی وقت مقرر ہوتا تھا اور اچھی کارکردگی دکھانے والے طلبا انعام کے حقدار قرار پاتے۔ مزید برآں ۱۸۰۶ء میں ہَرٹ فورڈ کیسل میں برطانویوں نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی کالج'' کے نام سے ایک تعلیمی درس گاہ قائم کی (ہَرٹ فورڈ کیسل میں یہ کالج ۱۸۰۶ء سے ۱۸۵۸ء تک قائم رہا) جس کا مقصد برطانیہ سے ہندوستان روانگی سے قبل کمپنی کے نوجوان افسران کو بنیادی تعلیم فراہم کرنا تھا۔[۳۷] داس نے لکھا ہے کہ (داس، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۹) کہ فورٹ ولیم کالج میں ہونے والے تمام تر تدریسی عمل کا مقصد صرف زندہ زبانوں کی تعلیم دینا تھا اور اس کالج

نے جس سمت کی جانب اپنا بہترین کردار ادا کیا، وہ تھا۔ ''روزمرہ اور بول چال کی زبان (نہ کہ ادبی حیثیت کی حامل زبان) کے استعمال کو ہر پہلو سے ممکن بنانے کے لیے نئی راہوں کو دریافت کرنا'' (قدوائی، ۱۹۷۲ء، ص ۳۰)۔

ہندوستانی کے بیانیہ قواعد

اہل زبان کے وضع کردہ قواعد:

چناں چہ جب ہندوستانی زبان کو برطانوی افسران کے دفتری امور کی انجام دہی کے لیے شمالی ہندوستان کی عوامی زبان قرار دیا گیا تو برطانویوں نے خود ہی اس زبان کے قواعد مرتب کرنے شروع کر دیے۔

مذکورہ بالا سطور میں جس دور کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے قبل مقامی ادبا نے ہندوستانی زبان کے قواعد کی کئی کتابیں اور لغات مرتب کی تھیں۔ ان میں زیادہ تر کتابوں میں سنسکرت زبان کے الفاظ کی تشریح ہوا کرتی تھی یا پھر ان کتب کے ذریعے فارسی شاعری میں توازن قائم رکھنے سے متعلق عروض کی وضاحت پیش کی جاتی تھی۔ دکنی نوابی کے دور میں فارسی لغات کی اشاعت عموماً فارسی-عربی رسم الخط میں کی جاتی تھی۔ ان میں زیادہ تر لغات، شاعرانہ انداز میں فارسی الفاظ و تراکیب کے معنی و مفہوم پر مبنی تھیں۔[۳۸] ایسے افراد جو فارسی زبان لکھ اور پڑھ سکتے تھے، ان کے لیے یہ لغات، قواعد کی کتب کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں بلکہ فارسی الفاظ کا فہم حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ مغلیہ شاہی دربار میں صرف فارسی زبان ہی مستعمل نہیں تھی (فیوجی، ۲۰۰۲ء، ص ۶۷)۔ ابوالفضل (۱۵۵۱ء-۱۶۰۲ء) نے اپنے ادبی شاہکار ''آئین اکبری'' میں ممکنہ حد تک درست طریقے سے سنسکرت زبان کی صوتیاتی نگارش کو فارسی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی (کونڈو، ۲۰۰۸ء)۔ ایک مقام پر انھوں نے کوزی مصمتہ ''ٹ'' کو ''تا یعنی قوقانیٔ ہندی'' (یعنی ہندی حرف 'ت' کے اوپر نقطہ لگا کر) ظاہر کیا ہے (کونڈو، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷)۔ اس وضاحت میں ابوالفضل نے کوزی مصمتہ ''ٹ'' میں لکھتے وقت نقاط کا استعمال کر کے اس الجھن کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو ''طا'' (اردو میں ''ط'') اور ''تا'' (اردو میں ''ت'') کے استعمال کے وقت پیدا ہوتی تھی۔ ہندوستان میں اس ضمن میں ملنے والی قدیم مثالوں میں سے یہ ایک مثال ہے جس میں فارسی حروفِ تہجی کی مقامی آواز و انداز سے تلفظ کے لیے رسم الخط کے معیارات مقرر کیے گئے ہیں، لیکن انھوں نے مقامی آوازوں سے بننے والے الفاظ کو دوسرے رسم الخط میں تحریر کرنے کے لیے نہ ہی نئی طرز کے حروف ایجاد کیے اور نہ ہی اعراب کا استعمال کیا۔ ابوالفضل نے رسم الخط کے جو معیارات قائم کیے، انھیں عنایت علی خان راسخ (پیدائش: ۱۷۰۲ء) کی مکمل حمایت حاصل رہی۔ راسخ کی تحریروں میں ہمیں فارسی-عربی رسم الخط کا ایک ایسا معیارِ ترسیم نظر آتا ہے جو مقامی آوازوں سے بننے والے الفاظ کے لیے مخصوص ہے، مثلاً ''کوز'' اور ''ہائیہ'' (نوشاہی، ۲۰۰۴ء)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ مقامی ادبا

ایسے بھی تھے جو مقامی بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ کی جو درست طور سے تلفظ بھی کیے جا سکیں، فارسی-عربی رسم الخط میں ترسیم کرنے کی مسلسل کوششیں کر رہے تھے۔ جب ہندوستان کی مقامی زبان ترقی کر کے ادبی زبان بنی تو یہاں کے مقامی ادبا نے بھی مقامی آوازوں سے بننے والے الفاظ کو فارسی-عربی رسم الخط کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ ایک غیر زبان کے رسم الخط میں ترسیم کے ضمن میں دیکھا جائے تو ہندوستان کی زبان نے محض ایک غیر زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ حاصل کر کے ہی ترقی نہیں کی بلکہ اس کی ترقی کا راز یہ بھی تھا کہ اس نے مخصوص آوازوں کو بھی اپنا لیا تھا۔ انھی مخصوص آواز و الفاظ نے اردو زبان کو ہندوستان کی دیگر مقامی زبانوں کے مقابلے میں نکھار کر مزید نفیس اور شائستہ بنا دیا۔

راسخ نے ایسی مثالیں بھی دیں کہ کس طرح مقامی زبان کی مخصوص آوازوں کی ترسیم کی جانی چاہیے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ انھوں نے ہائیہ ''بھ'' کی ترسیم یا پھر ''ں'' (نون غنہ) کی ترسیم کے لیے '' ؍ '' لگانے کی تجویز دی، مثلاً ''ب'' کے ساتھ اس کا زیریں استعمال کر کے (یعنی ''ب'') ''بھ'' کو ظاہر کیا۔ اسی طرح کوزی مصمتہ ''ٹ'' یا ''ڈ'' کے لیے راسخ نے دو نقاط کا استعمال کیا، یعنی ''ت'' لکھ کر ''ٹ'' کو ظاہر کیا (یعنی ''ت'') اور ''ڈ'' کو ظاہر کرنے کے لیے '' د '' کے اوپر چار نقطے لگا دیے (یعنی '' د '')۔

راسخ کی پیش کردہ یہ تجاویز نہایت اہمیت کی حامل ہیں کیوں کہ یہ ہندوستان کی مقامی بول چال کی آوازوں کی فارسی-عربی رسم الخط میں ترسیم کی اولین مثالوں میں سے ایک ہے۔ لیکن راسخ کی بے پناہ کوششوں کے باوجود بھی معیارِ ترسیم کے اصول وضع نہ کیے جا سکے۔

راسخ کے اصلی تحریری مسودوں میں کوزی مصمتوں کی ترسیم کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ ان مثالوں پر اگر نظر ڈالی جائے مثلاً ''اتھیا'' (یعنی ''ت'' کے اوپر دو اضافی نقاط کا استعمال) (''پھول بان''، ۱۶۵۰ء، ص۲۰)، ''اتہہ'' (یعنی ''ت'' کے اوپر اضافی لکیر کا استعمال) (''دیوان ولی''، ۱۷۳۲ء، ص۸۵)، ''تۃ'' (''ت'' کے اوپر دو اضافی نقاط کا استعمال) (''کارستان''، ۱۷۵۰ء(؟)، ص۱۰۹-۱۱۰)، ''اُتہایا'' (''راگ مالا''، ۱۷۵۹ء، ص۶۴)، ''انکوتہی'' (''ت'' کے اوپر اضافی لکیر کا استعمال) (''قصہ سیف الملوک و بدی''، ص۸۰)، ''اوتھی'' (''ت'' کے اوپر اضافی لکیر کا استعمال) (''دیوان یا عین''، ۱۷۸۰ء، ص۱۲)، ''تھا'' (''ت'' کے اوپر اضافی لکیر کا استعمال) (''گلستان عشق''، ۱۷۸۵ء، ص۱)، ''بتۃ'' (''ت'' کے اوپر دو اضافی نقاط کا استعمال) (''تحفۃ الہند''، (؟))، ''روتی'' (''ت'' کے اوپر دو اضافی نقاط کا استعمال) (''قادری باری''، ۱۷۹۶ء، ص۳)، ''اوتہا'' (''دیوان سوز''، ۱۸۰۱ء، ص۱۷)، ''میتہائی'' (''رانی کیتکی کی کہانی''، (؟)، ص۲)، ''بیتھی'' (''ت'' کے اوپر دو اضافی نقاط کا

استعمال)("Hindee Stroy Teller"، ۱۸۰۳ء، ص ۵۵)، ''اوٹھائی'' (''دیوان افسوس''، ۱۸۱۰ء، ص ۳۷)، ''اُٹھایا'' (''ت'' کے اوپر اضافی لکیر کا استعمال) (''کلیاتِ میر''، ۱۸۱۱ء، ص ۴۴۲)، ''ت'' (''ت'' کے اوپر اضافی لکیر کا استعمال)("AFW"، ۱۸۱۹ء، ص ۴)، ''توتے'' (''ت'' کے اوپر اضافی لکیر کا استعمال) (''کلیاتِ سودا''، ۱۸۲۵ء، ص ۵۹) وغیرہ۔ ہم بہ خوبی دیکھ سکتے ہیں کہ راسخ کی مذکورہ بالا ترسیم صرف ایک کاتب یا خوش نویس کی خصوصیت اور اس کے انفرادی کام کے طور پر باقی رہ سکی۔

اس طرح اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں یورپی اقوام کے مرتب کردہ قواعد کے بعد بھی ترسیم کے مختلف طریقے موجود رہے۔ کلیاتِ سودا میں جو حصہ ان کی شاعری کے مجموعے پر مشتمل ہے، اس میں ہم مقامی بول چال کی آوازوں کی ترسیم کے مختلف نمونے دیکھ سکتے ہیں جنھیں کئی کاتبوں اور خوش نویسوں نے لکھا (سودا، ۱۸۲۵ء)۔ راسخ کے فوراً بعد سراج الدین علی خان آرزو نے اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہی اردو کی اولین روایتی لغت مرتب کی جس کا نام ''نوادر الالفاظ'' تھا۔ نیز انشا کی ''دریائے لطافت'' کو اردو کی اولین قواعد کی کتاب تسلیم کیا جاتا ہے (شیکل اور اسنیل، ۱۹۹۰ء، ص ۸۹) جس میں وقت کے ساتھ ساتھ تیزی سے بدلتی ہوئی لسانی تبدیلیاں اور بول چال کے جملوں کے اہم حصوں مثلاً اسم ضمیر، صفت اور فعل وغیرہ کی وضاحت شامل ہے، لیکن اس کتاب میں ترسیم سے متعلق کسی بھی قسم کی وضاحت بیان نہیں کی گئی ہے۔

یورپی اقوام کی مرتب کردہ قواعد کی کتب:

یورپی اقوام نے قواعد کے ضمن میں جو کارنامے سرانجام دیے، وہ زیادہ تر اٹھارویں صدی عیسوی کے دوسرے وسط سے تعلق رکھتے ہیں۔ قواعد کی کتب کی اشاعت کے سلسلے میں جرمن نژاد جان جانشوا کیٹی لیئر اور ہالینڈ سے تعلق رکھنے والے بنجمن شولزی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلے پہل قواعد کی ان کتابوں کو عیسائیت کی تبلیغ میں مدد فراہم کرنے کی غرض سے مرتب کیا گیا تھا۔ شولزی خود بھی ڈنمارک سے تعلق رکھنے والی ایک عیسائی تبلیغی جماعت کا رکن تھا اور اسے ہندوستان بہ طور عیسائی مبلغ بھیجا گیا تھا۔ اس کی قواعد کی کتاب مدراس سے شایع ہوئی (شولزی، ۱۷۷۷ء)۔ جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے کہ انگریزی زبان میں ہندوستانی کے قواعد کی اشاعت اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں شروع ہوئی، لہٰذا یہ نکتہ قابل غور ہے کہ بول چال اور قواعد کی یہ کتابیں ہندوستان کے مقامی لوگوں کے بجائے باہر سے آئے ہوئے لوگوں نے مرتب کر کے شایع کروائیں (کشمیری، ۲۰۰۳ء، ص ۴۸۰)۔ جس طرح یورپی اقوام کے لیے لاطینی زبان ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت رکھتی تھی، اسی طرح ہندوستانی بھی یورپی اقوام کے لیے ایک غیر زبان تھی۔ لہٰذا یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ یورپی اقوام نے یورپی قواعد کے سیاق و سباق ہی کے ضمن میں ہندوستانی زبان کے قواعد

مرتب کیے۔ پھر جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوگیا تو ہندوستان کی مقامی زبانوں کی تعلیم باقاعدہ طور پر دی جانے لگی۔ یوں لسانی تدریس کا یہ نظام مزید بہتر اور منظم انداز میں شروع ہوگیا۔ گل کرسٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ولزلی نے انھیں کالج میں ہندوستانی زبان کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں مکمل طور سے بااختیار بنا دیا تھا۔ اس کالج میں ہندوستان کی مقامی زبانوں میں طلبا کے مابین مختلف موضوعات پر مباحثے منعقد کیے جاتے تھے، مثلاً ''ہندوستان کے خطے میں صرف ہندوستانی زبان کا استعمال ہی سب سے زیادہ مفید ہے'' جیسے موضوعات وغیرہ ("CFW"، ص ۵۹)۔ نیز ان مباحثوں میں جیتنے والے مقررین انعامات کے حق دار قرار پاتے۔ کالج کا دورہ کرنے والی شخصیات کے ہاتھوں ان جیتنے والے طلبا کو انعام دیئے جاتے۔ کالج کا دورہ کرنے والی شخصیات نے کالج کی سالانہ رپورٹ میں کالج کے نظامِ تعلیم و تدریس پر مکمل اطمینان کا اظہار کیا تھا۔
("CFW"، ص ۶۱، ص ۸۰ اور ص ۸۳)[۳۹]

گل کرسٹ کی یہی کامیابیاں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ہندوستانی زبان کی تدریس میں انھیں سب سے اونچا درجہ کیوں کر ملا۔ مزید برآں گل کرسٹ کی ہدایت پر ۱۸۰۲ء میں کلکتہ شہر میں کتابوں کی اشاعت کی غرض سے ''ہندوستانی پریس'' قائم کیا گیا (داس، ۱۹۷۸ء، ص ۸۲-۸۳)۔ اس پریس سے کل ۱۳۲ کتب شایع ہوئیں جن میں زیادہ تر درسی کتابیں تھیں جو عوامی سطح پر گفتگو کو بہتر بنانے کے لیے شائع کی گئی تھیں۔ ان کتابوں کی اشاعت میں گل کرسٹ نے ذاتی طور پر دل چسپی لی تھی (داس، ۱۹۷۸ء، ص ۶۸)۔ چوں کہ ان میں زیادہ تر عوامی فہم کی نثری کتابیں شامل تھیں، لہٰذا جدید اردو نثر کی ترقی کے سلسلے میں گل کرسٹ کی خدمات لائقِ تحسین اور حقیقتاً ناقابلِ فراموش ہیں (صدیقی، ۱۹۶۰ء؛ قدوائی ۱۹۷۲ء، عبیدہ ۱۹۸۳ء)۔

ان کتابوں کی اشاعت نے ہندوستان میں صرف کتابوں کے ایک اشاعتی یا چھپائی کے نظام کی بنیاد ہی نہیں ڈالی بلکہ معیارِ رسم الخط بھی قائم کیا۔ ۱۷۷۸ء میں سر چارلس ولکنس نے ضلع ہُگلی میں بنگالی زبان کے قواعد کی ایک کتاب شایع کی۔ کتاب کا 'متن' بنگالی زبان کے حروفِ تہجی میں شائع ہوا تھا۔ آگے چل کر ۱۷۸۰ء میں انھوں نے ایک انگریزی-فارسی لغت شایع کی۔ اس کتاب میں فارسی الفاظ نستعلیق طرز (نستعلیق فانٹ) میں چھاپے گئے تھے (احمد، ۱۹۸۵ء، ص ۵۵)۔ چوں کہ سر ولکنس کی ایک وجۂ شہرت یہ بھی تھی کہ ان کی فارسی کی قلمی لکھائی بہت خوبصورت تھی، لہٰذا ان کے چھاپے ہوئے الفاظ بھی بہت مشہور ہوئے۔ لہٰذا اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مقامی زبانوں کے الفاظ کی مذکورہ بالا طریقے سے چھپائی نے معیارِ رسم الخط کو مزید ترقی دی۔

ہندوستانی حروف تہجی اور رسم الخط

ہندوستانی زبان کے بیانیہ قواعد کا شجر، اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام تک ہندوستانیوں (انشا بہ طور نام ور ہندوستانی ادیب) اور برطانویوں (گل کرسٹ بطور نام ور ماہر لسانیات)، دونوں کی زمینوں پر پھل پھول چکا تھا۔ انشا قواعد سے متعلق تصانیف تحریر کرنے میں اس قدر دل چسپی کیوں لینے لگے تھے؟ اس راز پر سے تا حال پردہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے اور نہ ہی یہ پتا چل سکا ہے کہ انشا کو اس بات کا علم تھا یا نہیں کہ برطانویوں نے بھی ہندوستانی کے قواعد سے متعلق تصانیف پر کام شروع کر دیا تھا۔ میں زیر نظر مقالے میں انشا اور گل کرسٹ، دونوں کے وضع کردہ ہندوستانی زبان کے حروف تہجی اور رسم الخط کا باریک بینی سے مطالعہ پیش کرنا چاہوں گا۔

ہندوستانی حروف تہجی سے متعلق انشا کی تصانیف:

انشا نے اپنی تصنیف ''دریائے لطافت'' میں، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے، کئی ہندوستانی حروف تہجی بیان کیے ہیں جن کا ذکر مندرجہ سطور میں موجود ہے:

> ''اردو زبان کی اصل حقیقت یہی ہے کہ کئی زبانوں کے ملاپ سے کشید ہو کر ایک زبان ''اردو'' وجود میں آئی، لہٰذا اس زبان کے حروف تہجی بھی بہت سے ہیں۔ اہل زبان (فصحا) اور اہل علم (محققین) ان حروف تہجی کی تعداد ۸۵ بتاتے ہیں جب کہ زبان و ادب سے ناواقف لوگوں کے نزدیک ان کی تعداد ۹۵ ہے۔ ان حروف تہجی کا شمار کرتے وقت چار حروف ایسے ہیں جن کی حروف تہجی کی حیثیت کے متعلق ہمیشہ شبہ رہا ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ جب 'ڈ' اور 'خ' کو 'ن' کے ساتھ ملا کر پڑھا جاتا ہے، جب 'س' کو 'ی' کے ساتھ ملایا جاتا ہے، جب 'ج' کو 'ح' کے ساتھ ملایا جاتا ہے؛ یا پھر جب 'ث' کو 'ح' کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ مزید برآں چھ حرفوں کی حیثیت بھی متنازعہ رہی ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے: 'ز' اور 'ش' کے حروف کا 'ن' کے ساتھ ملاپ، 'پ' اور 'الف' کے حروف کا 'و' کے ساتھ ملاپ؛ اور 'م' اور 'ی' کے حروف کا 'ن' کے ساتھ ملاپ۔'' (انشا، ۱۹۳۵ء، ص ۸-۹)

مذکورہ بالا سطور بیان میں انشا نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ چند غنائی آوازوں مثلاً دان، خان وغیرہ کو حروف تہجی کی طرح علیحدہ حیثیت ملنی چاہیے، جس طرح ''د'' اور ''خ'' کو حاصل ہے۔ نیز کچھ پست مصوتوں کے ساتھ استعمال ہونے والے مصمتے مثلاً ''شی''، ''جی''، ''می'' وغیرہ کو بھی حروف تہجی کی حیثیت ملنی چاہیے، جس طرح ''شا''، ''شو''، ''جا''، ''جو'' وغیرہ کو حاصل ہے۔ مزید برآں ہائیہ آوازوں کے حامل حرفوں مثلاً ''جھ''، ''چھ''، ''دھ'' وغیرہ کو جو دو حرفوں کا مجموعہ ہیں، ان میں ہائیہ ''ھ'' کے ساتھ منسلک مصمتوں کو بھی الگ حروف تہجی کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ ان بیانات کے باوجود انشا نے انفیا اور ہائیہ

کے رسم الخط کی وضاحت نہیں کی۔ جب کوئی مصمتہ کسی پست مصوتے کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے تو دیوناگری حروف تہجی مثلاً ''شا''، ''شی''، ''شو''، '' شُ''، ''ش'' وغیرہ کے الفاظ لکھنے کے لیے مصمتہ کے ساتھ مصوتہ ظاہر کرنے کے لیے اعراب لگائے جاتے ہیں۔ لیکن فارسی-عربی حروف تہجی میں اس مقصد کے لیے دو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ مصمتہ کو صرف مصوتہ کے ساتھ منسلک کر کے لکھا جائے، جیسے ''ش'' اور ''ی'' کو ملا کر ''شی'' لکھا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مصمتہ کے ساتھ اعراب کا استعمال کیا جائے مثلاً زیر، زبر اور پیش وغیرہ لگائے جائیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے جو تحریری مسودے، عصر حاضر میں محفوظ ہیں، ان میں نہ صرف دونوں طریقوں سے تحریر کی گئی ہے بلکہ اکثر صفحات ایسے بھی ہیں جن میں ایک ہی صفحے پر دونوں طریقوں سے لکھا گیا ہے، لیکن چوں کہ ان میں زیادہ تر مسودے شاعری سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا قارئین جب کسی لفظ کو پڑھتے ہیں تو وہ نہایت آسانی کے ساتھ خود ہی شعر کا وزن برقرار رکھنے کے لیے ایک جیسے دکھائی دینے والے الفاظ میں تفریق کر سکتے ہیں مثلاً ''اِس'' اور ''اُس'' کا فرق بآسانی سمجھ جاتے ہیں۔ آج کے دور میں فارسی-عربی رسم الخط میں اعراب کی حیثیت محض نشانات کی سی رہ گئی ہے اور اب انھیں حروف تہجی کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

ہائیہ کے ضمن میں اگر غور کیا جائے تو دیوناگری زبان میں ''بھا'' اور ''کھا'' اور ان جیسے دوسرے حروفوں کے لیے الگ حروف تہجی موجود ہیں لیکن فارسی-عربی رسم الخط میں ایسا نہیں ہے مثلاً ''چ'' اور ''ن'' الگ حروف کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ''چور'' اور ''چھوڑ''، ''انوں'' اور ''انھوں''، ''چھ'' اور ''نھ'' وغیرہ کو دو حرفی حیثیت دی جاتی ہے۔ ''آنکھ'' اور ''آکھ'' توازن کے لحاظ سے ہم وزن ہیں۔ انشا نے ''آن'' کو بحر کے مطابق ایک الگ حیثیت کا حرف تسلیم کیا تھا۔

بحر کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی بحث، موضوع مقالہ نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ راسخ کی طرح انشا نے بھی تواضعی آوازوں اور اشعار میں توازن برقرار رکھنے والے عناصر کو فارسی-عربی رسم الخط کے دائرے میں لانے کی کوشش کی تھی۔

گل کرسٹ کا وضع کردہ رسم الخط:

انشا کے دور کے آس پاس ہی گل کرسٹ بھی ہندوستانی زبان کے قواعد مرتب کرنے میں مصروف عمل تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب پلٹس نے اپنی تصنیف " *A Grammar of Hindustani or Urdu Language*" شایع کروائی تو اس کتاب کے مطابق اردو زبان کے حروف

تہجی کی کل تعداد، پینتیس (۳۵) تھی، اگر چہ عام خیال یہی تھا کہ ان کی تعداد ۳۵ سے زیادہ ہی ہے۔

۱۷۹۸ء میں گل کرسٹ نے اپنی پہلی ہندستانی زبان کے قواعد کی کتاب "Oriental Linguist" میں لکھا کہ ہندوستانی زبان میں کل گیارہ مصوتے (سات بلند مصوتے اور چار پست مصوتے) اور بائیس مصمتے ہیں۔ اس کے بعد "SEH" میں انھوں نے دعوی کہ یہ تعداد گیارہ مصوتوں اور اڑتالیس مصمتوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے انشا کی روش پر چلتے ہوئے بلند مصمتوں اور ہائیہ کو علیحدہ حروف تہجی کی حیثیت دے دی تھی۔ حیرت انگیز طور پر ہائیہ کی جتنی تعداد انشا نے بیان کی تھی، اتنی ہی گل کرسٹ نے بھی بتائی، اگر چہ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں "HP" میں یہ لکھا تھا کہ ہندوستانی رسم الخط میں چھتیس مصمتے اور تیرہ مصوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گل کرسٹ کے ذہن میں خود بھی یہ بات واضح نہ ہو پائی تھی کہ ہندوستانی رسم الخط کتنے حروف تہجی پر مشتمل ہے۔ ۱۸۱۰ء میں انھوں نے اپنی شایع ہونے والی کتاب میں لکھا کہ:

> ''ہندوستان کے طلبا نے میری بیش تر گزشتہ تصانیف کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن ان میں ہندی-رومن طریقۂ ترسیم اس قدر درست اور مناسب طریقے سے وضع نہ کیا جا سکا جس طور سے اس کتاب میں کیا گیا ہے۔'' ("HP"، ص۱۰)

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ رومن حرفوں میں ترسیم کی کچھ نوعیتیں، دراصل ان کا اصل منصوبہ تھیں ("HP"، ص۱۰)۔ یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ گل کرسٹ ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے رسم الخط کو معیاری بنانے پر توجہ دی۔

گل کرسٹ نے اپنی تصنیف "HP" میں بیان کیا ہے کہ ''ہندی-رومن رسم الخطی حروف'' میں آوازوں کی کل تعداد، بہتّر (۷۲) ہے، جب کہ فورٹ ولیم کالج کی سالانہ رپورٹ (۱۸۱۹ء) میں ان کی تعداد کو بڑھا کر اٹھتر (۷۸) بیان کیا گیا ہے ("ACF"، ص۴)۔ اس فرق کا حساب لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کچھ آوازوں کا اضافہ کیا گیا تھا مثلاً بلند مصوتے، جیسے 'a، 'i، 'u، 'o، 'ue، 'uo یا مصمتے sh کا اضافہ جب کہ کچھ آوازوں کو منسوخ کر دیا گیا تھا، مثلاً w وغیرہ۔ مزید برآں انھوں نے رومن حرفوں کی تراقیم بھی وضع کیں، جیسے '' a '' کا پست مصوتہ ''u'' سے ظاہر کیا اور ''a'' کے پست مصوتہ کے لیے زیریں نقطے کا استعمال کیا اور اسے ''u'' سے ظاہر کیا۔ اسی طرح ''آ'' (جو ''ے'' کے ساتھ لکھا جاتا ہے) کے بلند مصوتہ کو مختصر الف (یعنی ''ا'') کے ساتھ استعمال کرنے کے لیے دو زیریں نقاط کا استعمال کیا اور اسے ''a'' لکھا۔ اسی طرح ''ض'' کو ''z'' سے ظاہر کیا۔ ہائیہ کو ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے مختصر سا افقی خط (یا کھڑا خط) استعمال کیا، مثلاً ''بھو'' (b hu)، ''چھو'' (ch hu) اور ''دھو'' (d hu) وغیرہ ("HP"، ص۱۲)۔ ترسیم میں اس طرز

کے اضافوں کے ساتھ ساتھ گل کرسٹ نے رسم الخط کی خصوصیات میں بھی تبدیلیاں کیں، جیسے ''غ'' کو ''ghain'' لکھنے ("HP") کے بجائے ایک زیریں خط کے اضافے کے ساتھ ''ghain'' لکھا ("OL"، ص۱۲)۔ نیز کوزی مصمتوں جیسے ''t''، ''d'' اور ''r'' ("HP") کو ترچھا کر کے اٹیلک ٹائپ میں لکھا، جیسے ''t''، ''d'' اور ''r'' وغیرہ ("OL"، ص ۷)۔ کئی دہائیوں تک یہی طریقہ رائج رہا۔ اس کے علاوہ اگرچہ ''ء''، ''زبر''، ''زیر''، ''پیش'' اور ''بیسارگ'' وغیرہ اس وقت حروف تہجی نہیں سمجھے جاتے تھے، لیکن گل کرسٹ نے ایک مقام پر انھیں اعراب کی حیثیت دی ("HP"، ص ۱۳) جب کہ ایک دوسرے مقام پر انھیں علیحدہ حیثیت کی حامل آوازوں کی حیثیت بھی دی۔[۴۰]

لہٰذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گل کرسٹ نے ایک مختصر سے عرصے کے دوران اپنے وضع کردہ رسم الخط میں کئی مرتبہ تبدیلیاں کیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گل کرسٹ اس دور میں ہندوستانی قواعد مرتب کرنے کے سلسلے میں بااختیار ہونے کے باوجود الجھن میں مبتلا تھے۔ ہندوستانی رسم الخط کی عمارت کی تعمیر مکمل ہونے کے قریب تھی جس کے معمار برطانوی تھے۔ مزید برآں یہ کہ رسم الخط اور اس کے قواعد کی توضیع، انیسویں صدی کے آغاز میں ایک ایسی زمین کی صورت اختیار کر چکی تھی جس پر ہل چلنا شروع ہو گیا تھا۔

یہ معلوم کرنا از حد ضروری ہے کہ غیر ملکی اقوام کے لوگوں، مثلاً گل کرسٹ نے رسم الخط کی توضیع کن طریقوں سے کی۔ چوں کہ اس دور میں شمالی ہند کے ادبی حلقے کی تمام سرگرمیوں میں فارسی-عربی رسم الخط کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، لہٰذا ایک مقامی ادیب ''راسخ'' نے مقامی بولی کی آوازوں کو فارسی-عربی رسم الخط میں ڈھالا۔ انشا نے بھی مقامی بولی کی آوازوں کو فارسی-عربی رسم الخط کے توازنی نظام میں مدغم کرنے کی کوشش کی۔ دوسری جانب سر ولیم جانس نے بھی اسی سلسلے میں کوششیں کیں اور اعراب سے مدد لی۔ ان کے کام نے گل کرسٹ کو بہت متاثر کیا اور پھر گل کرسٹ نے سر جانس کی پیروی کی۔ گل کرسٹ نے لکھا کہ:

> ''سر ولیم جانس (مرحوم) نے نہایت منصفانہ اور بے باکانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایشیاٹک ریسرچز کی جلد اوّل، ص ۱۳ پر لکھا کہ 'یہ بات انتہائی مضحکہ خیز اور قابل شرم ہے کہ ہماری انگلش زبان، حروف تہجی اور رسم الخط کے حوالے سے ایک ناقص زبان ہے۔ ہندوستانی، فارسی اور عربی الفاظ کو انگریزی تو دور کی بات، رومن حرفوں سے ظاہر کرنا بھی ناممکن ہے۔ اگرچہ ہم اس زبان کے الفاظ کو درست تلفظ کرنے کے بجائے نہایت بے ڈھنگے طریقے سے بولتے ہیں، البتہ کچھ نئے حرفوں کا مجموعہ اگر استعمال کر لیا جائے تو یہ اقدام زیادہ بہتر نوعیت کا حامل ہوگا اور آسانیاں بھی پیدا کر دے گا۔ جس طرح فرانسیسی زبان میں اعراب استعمال ہوتے ہیں، بشمول چند وہ جو مشتق پر تحریر کیے جانے والے علمی مقالہ جات میں ہم اختیار کر چکے ہیں، تو ان کی مدد سے ہم فخریہ طور پر تمام ایشیائی

زبانوں کی علامات کو اپنی زبان کے موجودہ الفاظ سے ظاہر کر سکتے ہیں، مثلاً دیوناگری زبان کو روانی و سلاست اور دیگر تمام پہلوؤں سے مکمل طور پر اپنی زبان کے برابر کیا جا سکتا ہے جس سے کوئی بھی ایسا شخص جو صرف بنیادی حروف کا علم جانتا ہو، کسی بھی قسم کی غلطی کیے بغیر اور نہایت روانی کے ساتھ تمام اسمائے معرفہ و نکرہ یا ایشیائی ادب کے رسائل و جرائد میں شایع حوالہ جاتی اقتباسات کو بآسانی اپنی زبان میں تبدیل کر سکتا ہے۔'' ("HP"، ص۱۸)

اسی بات کو بنیاد بناتے ہوئے گل کرسٹ نے اعراب کا استعمال اختیار کیا اور ''ہندی-رومن کتبیاتی نظام رسم الخط'' ایجاد کیا ("HP"، ص۱۳)۔ گل کرسٹ کے مطابق ایسا کرنے سے ''ناگری اور رومن حروف، پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ بہتر طور پر ہم پلہ محسوس ہونے لگے ہیں'' ("HP"، ص۱۳)۔[۴۱]

گل کرسٹ نے دیوناگری رسم الخط کے مقابلے میں فارسی-عربی رسم الخط پر زیادہ توجہ دی۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ اس کے جواب میں گل کرسٹ کی ایک ذاتی اور دل چسپ رائے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ ناگری نظام میں اس (دیوناگری رسم الخط) کی مناسب و موزوں حیثیت و اہمیت کے گن گائے جاتے ہیں، لیکن میں اس سے اپنی ناپسندیدگی کا اعتراف کرتا ہوں'' ("HP"، ص۱۵)۔ پچھلی سطور میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ گل کرسٹ کو ہندوستانی زبان ہی کے قواعد مرتب کرنے کے سلسلے میں مکمل اختیار حاصل تھا۔ ان کے اس اعتراف کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ درحقیقت مغلیہ شاہی دربار میں فارسی-عربی حروف نسبتاً زیادہ مقبول اور مستعمل تھے اور اسی لیے انھوں نے ایک دوسرے مقام پر لکھا کہ ''ناگری زبان، فارسی (فارسی-عربی) سے کم تر بھی ہے اور افادیت کے لحاظ سے بھی پیچھے ہے'' ("OL"، ص۳۳۳)۔ اس اہم نکتے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ گل کرسٹ کی ذاتی ترجیحات کی وجہ سے ہی دیوناگری رسم الخط کے بجائے فارسی-عربی رسم الخط میں متعدد کتابوں کی اشاعت ہوئی۔

گل کرسٹ کا وضع کردہ رسم الخط اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ رومن حروف پر نقاط بطور اعراب کس طرح لگائے جائیں گے جس سے ہندوستانی زبان سیکھنے والے غیر ملکی افراد کو کسی قسم کی پریشانی یا الجھن کا سامنا نہ ہو ("HP"، ص۱۳)۔

انھوں نے فارسی-عربی کے حرفوں مثلاً ''ب''، ''پ'' اور ''ٹ'' وغیرہ کے حرفوں کو رومن طریقے سے لکھتے وقت ان نقاط کے استعمال کی افادیت کو سراہا کہ ان نقاط کی تعداد اور ان کے مقام سے آوازوں کے مابین بآسانی فرق کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ ''فارسی-عربی میں ان نقاط کی افادیت معلوم ہونے کے بعد میں نے ان میں اضافہ کیا اور کچھ ناگری علامتوں کو ظاہر کرنے کے لیے، چاہے وہ تھوڑے فاصلے پر ہی

کیوں نہ ہوں، ختمہ کا استعمال کیا جن کے لیے اس کے علاوہ فارسی-عربی اور دیگر رسوم الخط میں کوئی دوسرا طریقہ موجود نہ تھا، جب خالصتاً مسلمانوں سے منسوب چند حلقی اور اسی طرح کی دیگر آوازوں کو تلفظ کرنے کے لیے ناگری زبان، ناقص و ناکافی دکھائی دے رہی تھی" ("HP"، ص۱۴)۔ انھوں نے عربی اور فارسی آوازوں کو رسم الخط میں ظاہر کرنے کے لیے دیوناگری حرفوں پر اعراب لگائے۔ انھوں نے اس بات کو واضح کیا کہ ہندوؤں کی بول چال کی زبان میں کچھ مخصوص آوازیں مثلاً "z" کی آواز نہیں ہے۔ لہٰذا جب ہم اس ("z" کی) آواز کو ظاہر کرنے کے لیے "j" کے ساتھ ایک زیریں نقطہ استعمال کرتے ہیں تو الٹا ہمیں ہی شرمندگی ہوتی ہے" ("HP"، ص۱۶) کیوں کہ وہ "j" کے ساتھ زیریں نقطہ لگانے پر بھی "z" کی آواز نہیں نکال سکتے۔ آج بھی ہم "z" کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے رومن طریقے سے "j" کے ساتھ ایک زیریں نقطہ استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح ہندی حرف کے ساتھ بھی ایک زیریں نقطہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ گل کرسٹ سے قبل بھی ناگری رسم الخط میں نقاط کی مدد سے آوازوں کو ظاہر کیا جاتا ہو، لیکن گل کرسٹ کے بیان کے بعد ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسم الخط میں نقاط کے استعمال کے اس نظام کو گل کرسٹ نے ہی رائج کیا۔ ایسا ہی کچھ سلسلہ فارسی-عربی حرفوں کے ساتھ بھی ہے جس کا سبب گل کرسٹ کا وضع کردہ رسم الخط ہی ہے۔ جس طرح پچھلی سطور میں بیان کیا گیا کہ خوش نویسوں کے مطابق دیسی بول چال کی آوازوں کی فارسی-عربی حرفوں میں ترسیم کے متعدد طریقے موجود تھے اور گل کرسٹ نے فارسی-عربی حرفوں کے ساتھ مختصر خطوط کا استعمال کرتے ہوئے معیارِ ترسیم مرتب کیا۔[۴۲]

فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۳ء میں شایع ہونے والی کتابوں مثلاً "خیر و افروز" یا "The Hindee Stroy Teller" کا مطالعہ کیا جائے تو کتاب کے اختتام پر گل کرسٹ کے وضع کردہ رسم الخط کی طباعی موجود ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ تمام اشاعتی تصانیف، گل کرسٹ کے وضع کردہ آسان اور سلیس رسم الخط میں تحریر کی جاتی ہیں کیوں کہ کسی ہندوستانی کے لیے بھی اس کے بغیر مطالعہ کا عمل مشکل ثابت ہوگا، بالخصوص بلند مصوتوں "ی" اور "ے" کے درمیان تفریق کے موقع پر، تاوقتیکہ قاری کو اس لفظ کے مطلب کا از خود علم نہ ہو۔ اسی وجہ سے جناب گل کرسٹ کے ایجاد کردہ رسم الخط کے متعلق معلومات یہاں بیان کی گئی ہیں (حسین، ۱۹۶۵ء، ص۲۸۷)۔ لہٰذا تمام کوزیات کو ظاہر کرنے کے لیے حرف کے ساتھ مختصر عمودی خطوط کا استعمال کیا جاتا ہے (مثلاً "khat" (خط)، "arzi" (عرضی) وغیرہ) (حسین، ۱۹۶۵ء، ص۲۸۸-۲۸۹)۔[۴۳]

گل کرسٹ نے ہندوستانی زبان کے لیے جو رسم الخط وضع کیا، اسے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف اور بالخصوص کالج کے ابتدائی دور کی تصانیف کی اشاعت کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔[۴۴]

"The Hindee Stroy Teller" ، رومی، فارسی، عربی اور دیوناگری رسوم الخط میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے تو ترسیم اور رسم الخط کی وضاحت کی گئی ہے اور پھر حرفوں کا ایک جدول شامل کیا گیا ہے جس میں فارسی-عربی کے سینتیس (۳۷) جب کہ دیوناگری زبان کے پچاس (۵۰) حروف شامل ہیں۔ پھر مقامی بول چال کی تمام آوازیں' نیز فارسی اور عربی زبانوں کی بھی تمام آوازیں بہ عنوان: "Hindoostanee Alphabets Reformed, or an Abstract Comparative Sketch of the Hinduwee, Farsee, Urbee(Arabi)" کے ذیل میں درج کی گئی ہیں جن کی کل تعداد ساٹھ (۶۰) ہے۔ اس کے ساتھ ہی ستر (۷۰) رومن حروفوں کو فارسی-عربی اور دیوناگری رسوم الخط میں تحریر کیا گیا ہے۔ گل کرسٹ' رسم الخط اور نظام ترسیم کو مرتب کرنے میں کس حد تک کام یاب رہے' اس کا اندازہ ان کی اس کتاب کے مطالعے سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اس کتاب کو پوری طرح سمجھنا' ایک نہایت مشکل کام ہے لیکن گل کرسٹ کے دور میں ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو ہندوستانی زبان میں مہارت رکھتا ہو' حتی کہ جب گل کرسٹ نے ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا' تب بھی کالج میں ان کا وضع کردہ رسم الخط ہی مستعمل رہا۔[۴۵]

ایک غیر ملکی ہونے کے ناطے گل کرسٹ کے لیے یہ بات یقیناً حیران کن تھی کہ ایک ہی بول چال کی زبان دو مختلف قسم کے حروف تہجی رکھتی ہے ("HP"، ص ۱۱)۔ راسخ اور انشا نے بھی دیسی بول چال کی آوازوں کی فارسی-عربی حروفوں میں ترسیم کی کوشش کی لیکن گل کرسٹ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ان آوازوں کو اپنی زبان کے لیے رومن حروفوں میں منتقل کیا۔ پھر اس ترسیمی عمل کے بعد ان حرفوں کا آوازوں کے ساتھ موازنہ کیا اور بالآخر ان آوازوں کو اس طور سے پیش کیا کہ ان میں نہ ہی کوئی امتیازی یا الگ سے ایجاد کردہ حروف شامل تھے اور نہ ہی اعراب کا استعمال کیا گیا تھا، جس طرح انھوں نے اس سے قبل ان آوازوں کی رومن حرفوں میں ترسیم کے وقت کیا تھا۔ گل کرسٹ نے لکھا تھا کہ ''ہندی-رومن کتبیاتی نظامِ رسم الخط کا جو منصوبہ میں نے بنایا تھا، وہ محض ان ابجدی اصولوں کی توسیع تھی جو کسی بھی غیر زبان کو سیکھنے کے لیے ہمارے سامنے موجود ہونا ضروری ہیں'' ("HP"، ص ۲)۔

اس طریقے کو اختیار کر کے گل کرسٹ نے ہندوستانی زبان کے رسم الخط کا معیار قائم کیا جو اس سے قبل موجود نہ تھا۔ اس پہلے ہیڈلے کی مثال موجود تھی لیکن ہیڈلے نے جو قواعد مرتب کیے تھے، ان کا مقصد صرف بول چال میں آسانی پیدا کرنا تھا، نیز انھوں نے فعل حال کی تمام اقسام کو ''ہوا'' لکھ کر ظاہر کیا تھا (ہیڈلے، ۱۷۹۶ء، ص ۱۶-۲۰)۔ ہیڈلے نے صرف عملی طور پر ہندوستان کی زبان کا علم جاننے کی غرض

سے یہ کتاب لکھی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہندوستانی زبان کسی ہندوستانی فرد کی سمجھ میں آ رہی ہے تو گفتگو کا یہ طریقہ درست ہوگا، چاہے قواعد کی رو سے کوئی انگریز غلط طریقے ہی سے ہندوستانی زبان کیوں نہ بول رہا ہو، بس ہندوستانی کی سمجھ میں یہ آنا ضروری ہے کہ وہ انگریز کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ لیکن گل کرسٹ کا مقصد یہ نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انگلستانی قوم کے لوگ بالکل درست طریقے سے ہندوستانی زبان میں گفتگو کے قابل بنیں۔[۴۶]

حاصل مطالعہ:

زیر نظر مقالے میں اٹھارویں اور انیسویں، دونوں صدیوں کے ابتدائی سالوں میں اردو رسم الخط کی خصوصیات و حالات کا تحقیقی مطالعہ عمل میں لایا گیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں جو سیاسی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان سے اردو رسم الخط کی وابستگی پیدا ہونے لگی اور پھر یہ وقت بھی آیا کہ اردو زبان، ہندوستانی - اسلامی کلچر کا تہذیبی نشان بن گئی۔

اس سے قبل ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے ابتدائی چند سال دراصل ایک ایسا وقت تھا جب ہندوستان میں فارسی زبان کی اہمیت میں کمی واقع ہو رہی تھی جس کے باعث ادبی زبان، فارسی کا پیراہن اتار کر ہندوستانی (اردو) کا لبادہ اوڑھ رہی تھی اور اس وقت اس بات کو بھی ایک صدی کا طویل عرصہ گزر چکا تھا جب ادبا نے ریختہ میں شاعری کرنا شروع کی تھی۔ مزید برآں اس وقت برطانوی قوم خود کو ہندوستان کے مالک و مختار کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی۔ لہٰذا جیسے جیسے ایک مقامی زبان (جو جدید بھی ہو) کی اہمیت و ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی تھی، ویسے ویسے برطانویوں نے ہندوستان میں ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کرنا شروع کر دیا جو ہندوستان کی عوامی زبان میں تھا۔

بالائی سطور میں اس بات کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مقامی ادبا مثلاً راسخ اور انشا وغیرہ کی تحریروں میں ہمیں رسم الخط کے متعلق تحقیقی نوعیت کی بحثیں نظر آتی ہیں۔ ان ادبا نے اس پہلو پر کام کیا ہے کہ مخصوص فارسی عروض و توازن کو قائم رکھتے ہوئے مقامی گفتگو کی آوازوں کو فارسی-عربی رسم الخط میں کس طرح تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ''رانی کیتکی کی کہانی'' قطعی طور پر ایک فرضی کہانی ہے لیکن اسے تحریر کرنے کے پس منظر میں مصنف کا مقصد وہی تھا جو راسخ کا تھا، یعنی مقامی گفتگو کی آوازوں کو فارسی-عربی رسم الخط میں تحریر کرنا۔

گل کرسٹ نے ہمیشہ دیوناگری حروف تہجی کے مقابلے میں فارسی-عربی حروف تہجی کے استعمال کو ترجیح دی، لیکن اس کے باوجود ان کا ترسیمی کام ان دونوں زبانوں کے رسوم الخط میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ دونوں غیر ہندوستانی زبانوں (یعنی عربی زبان

اور فارسی زبان) اور مقامی بولیوں کی رومن حروف تہجی میں ترسیم کی اور پھر رسم الخط کی دیگر بدلی ہوئی اشکال میں بھی ان زبانوں کی ترسیم کا عمل جاری رکھا۔ ان کی قواعد کی تصانیف کے مطالعے سے اس بات کا بہ خوبی احساس ہوتا ہے کہ انھیں ترسیم اور رسم الخط، دونوں کو معیاری بنانے کے لیے کس قدر مشکلات کا سامنا تھا۔ یوں تو ہندوستانی زبان کے علاوہ کئی زبانوں کی رومن حروف تہجی میں ترسیم کی متعدد مثالیں موجود ہیں لیکن گل کرسٹ کو اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے کام کے لیے ایسی زبان (یعنی ہندوستانی زبان) کا انتخاب کیا جسے اس سے قبل کبھی بھی اس لائق نہیں سمجھا گیا تھا۔ جس نظریہ کے تحت انھوں نے یہ سارا کام سر انجام دیا وہ یہی تھا کہ ہر بولی جانے والی زبان، قابل ترسیم ہے۔ یہ نظریہ نہایت مؤثر بھی ثابت ہوا اور ان کے کام کے لیے موزوں بھی۔ ہندوستان کی مقامی زبان کے قواعد مرتب کرنے اور بول چال کی آوازوں کو ان کے لیے مخصوص حرفوں اور الفاظ سے موازنہ کرنے کے باعث ہندوستان کے خطے میں تہذیبی اور مذہبی شناخت مزید واضح ہو کر سامنے آئی۔ یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے صرف مرکز میں بسنے والے فصحا کے زیر استعمال گفتگو کی مخصوص آوازوں اور محاورات و تراکیب نے ہندوستان کی اسلامی ثقافت کی علم بردار، اردو زبان کی تہذیبی تصویر کشی کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گفتگو کی آوازوں، الفاظ و محاورات اور رسم الخط کی انھی لامساوی خصوصیات نے ان دونوں زبانوں، ہندی اور اردو کے مابین جنم لینا شروع کیا اور ان کا مقصد صرف لسانی تفریق پیدا کرنا تھا۔

یوں اٹھارویں صدی میں ہندوستانی زبان کا ترسیمی معیار وضع کرنے کا عمل شروع ہوا جو انیسویں صدی کے آغاز تک ایک نظام معیار کی صورت میں قائم ہو چکا تھا، لیکن تبدیلی کا عمل جاری رہا اور انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک پلٹس کی مرتب کردہ ہندوستانی زبان کی لغت (*Platt's Hindustani Dictionary*) کی اشاعت عمل میں آ چکی تھی اور اس وقت ہندوستانی زبان جس رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، کچھ تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی اسی رسم الخط میں رائج ہے۔ رسم الخط سے متعلق اس زبان کا زیادہ تر کام مقامی افراد کے بجائے غیر ملکی اقوام نے کیا، بالخصوص پہلے پہل اس کام کو ایک غیر ملکی نے ہی شروع کیا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جس انداز میں گل کرسٹ نے ہندوستانی زبان کے قواعد مرتب کیے، کوئی دوسرا شخص اس انداز میں کام نہیں کر سکا۔ اگرچہ گل کرسٹ کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ مذہبی تفریق پیدا کرنے کی غرض سے اردو زبان کو ہندی زبان سے علیحدہ قرار دیا جائے لیکن آگے چل کر اس خطے میں ایسا منظر سامنے آنے لگا کہ یہ دونوں زبانیں، ہندی اور اردو، علیحدہ علیحدہ مذہبی شناخت کی حامل ہیں۔

تعلیقات

۱ فارسی زبان میں ہندوستان کے باشندوں کا ملک ''ہندُستان'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ لفظ ''ہندُستانی'' اسی سے نکلا ہے۔ اسٹین گاس کی فارسی-انگریزی لغت (۱۸۹۲ء، ص۱۵۱۴) میں ''ہندُستان'' کے علاوہ مزید دو الفاظ موجود ہیں: ''ہندوستان'' اور ''ہندیستان''۔ آپٹے کی سنسکرت-انگریزی لغت (۱۹۵۷ء، ص۱۷۵۸- ۱۷۵۹) بتاتی ہے کہ سنسکرت زبان کا لفظ ''سندھو'' ہی دراصل بنیادی لفظ تھا جس سے دونوں الفاظ ''ہند'' اور ''ہندو'' وجود میں آئے۔ اول الذکر میں ''و'' پست ہے جب کہ موخر الذکر میں بلند۔ گریرسن نے فارسی عروض کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "Linguistic Survey of India" میں (۱۹۲۱ء، ص۴۲) لفظ ''ہندُستانی'' کو درست قرار دیا۔ پلیٹس نے اپنی لغت (۱۸۸۴ء، ص۱۲۳۶) نے لفظ ''ہندُستانی'' کو ''ہندیستانی'' بھی لکھا اور ''و'' کو بلند کر کے ''ہندوستانی'' بھی۔ چوں کہ فارسی زبان میں ادائیگیٔ الفاظ میں توازن کے لحاظ سے ''ہندُستان'' اور ''ہندوستان'' ہم آہنگ ہیں اور تلفظ و آواز کا فرق نہیں رکھتے' اس لیے ممکن ہے کہ فارسی زبان کی عمومی بول چال میں ''و'' کو بلند و پست دونوں طرح سے استعمال کیا جاتا ہو اور یوں ''ہندُستان'' اور ''ہندوستان'' دونوں ہی الفاظ عوامی لب و لہجے میں استعمال کیے جاتے ہوں۔ ماضی سے نظریں ہٹا کر اگر ہم بیسویں صدی کی بات کریں تو اردو شعری سرمائے میں ایسے اشعار بھی نظروں میں آتے ہیں جن میں محض شعر میں توازن برقرار رکھنے کی غرض سے شعرا ''و'' کو بلند یا پست کر دیتے ہیں۔ مثلاً آتش کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں ''و'' کو پست کر کے ''ہندُستان'' کے بجائے ''ہندوستان'' لکھا گیا اور دوسرا شعر اقبال کا جس میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا:

ع الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں ہزاروں بت ہیں یاں ہندوستاں ہے (آتش)

ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا (اقبال)

اردو کے نثری سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔ سرسید احمد خان نے بیش تر اردو الفاظ مثلاً ''ہندوستان''، ''مرادآباد'' اور ''خان'' وغیرہ کو جب انگریزی حروف تہجی کی مدد سے پیش کیا تو انگریزی کے حروف ''u'' اور ''a'' کے استعمال میں تلفظ کو درست کرنے کے لیے ان کے سروں پر انتہائی مختصر افقی خط کھینچ دیے۔ یہ رومن طریقے میں اعراب کی صورت تھی۔ ''مرادآباد'' کو سرسید نے *Murádábád* '' لکھا جب کہ ہندوستان اور خان کو بالترتیب ''*Hindústán*'' اور ''*Khán*'' لکھا۔ قریشی اپنی کتاب (خان، سرسید احمد، ۱۸۷۳ء، دوبارہ اشاعت ۱۹۹۷ء، ص۲۰) میں سرسید احمد خان کی تحریر کے ایک اصل نسخے کا عکس شامل کیا ہے جس کے بعد لفظ ''ہندستان'' میں ''و'' کو بلند یا پست کر کے ''ہندُستان'' یا ''ہندوستان'' لکھنا اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ سرسید احمد خان کے اصل نسخے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سرسید احمد خان ''و'' کو بلند کر کے ''ہندوستان'' جب کہ رومن طریقے میں ''*Hindústán*'' لکھنے کو درست سمجھتے تھے۔ عمومی طور پر رومن طریقے میں ہندوستان کے باشندوں کے وطن کے لیے دو الفاظ مستعمل ہیں: ایک ''*Hindoostan*'' اور دوسرا ''*Hindustan*''۔ اول الذکر طریقہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ کا وضع کردہ ہے جنھوں نے ''oo'' استعمال کر کے ''و'' کو بلند ظاہر کیا جب کہ ''الف'' کو بلند کرنے کے لیے صرف ''a'' لکھا۔ وہ ''الف'' کو

پست کرنے کے لیے "u" استعمال کیا کرتے تھے۔ موخرالذکر طریقہ انیسویں صدی کے اختتام تک کافی حد تک مقبول عام ہو چکا تھا۔

۲ دہلی اور اس کے نواحی علاقوں (جیسے میرٹھ) میں عوامی سطح پر استعمال کی جانے والی بولی "کھڑی بولی" کہلاتی تھی۔ ہم اسے زبان کا درجہ نہیں دے سکتے کیوں کہ یہ گلی کوچوں اور بازاروں کی بولی تھی اور اسے کسی طور سے بھی سرکاری اور ادبی حیثیت حاصل نہ تھی۔ رومن طریقے میں اسے "*Khari Boli*" لکھا جاتا ہے۔ یہ بات اب تک تحقیق کے پیاسوں کو دعوت دے رہی ہے کہ اس بولی کو "کھڑی بولی" کب سے کہا جانے لگا۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے چھ مرتبہ "کھڑی بولی" کے الفاظ استعمال کیے جب کہ للولال جی اور صدر مشرا نے دو مرتبہ "کھڑی بولی" کا لفظ استعمال کیا ("ہندی ساہتیہ کوش"، جلد اول، ص ۲۴۹-۲۵۱)۔ فورٹ ولیم کالج کی ایک رپورٹ میں "کھڑی بولی" اور "ہندوی زبان" کو ایک قرار دیا گیا اور انھیں رومن طریقے میں بالترتیب "*Khree Boli*" اور "*Hinduvee*" لکھا گیا۔ ۱۸۱۰ء میں للولال جی نے "پریم ساگر" کا کھڑی بولی میں ترجمہ کیا۔ "پریم ساگر" مشرا کی تصنیف تھی جو اس وقت تک صرف برج بھاشا میں لکھی ہوئی تھی۔ اسے ہندوستانی پریس نے کتابی شکل میں شایع کیا تھا ("*ACF*"، ص ۲۸)۔ اس ترجمے میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کا کردار فراموش نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے للّو لال جی کو اس ترجمے پر آمادہ کرنے کے لیے نہایت دل چسپی کا اظہار کیا تھا اور انھیں اس کام کی طرف رغبت دلائی تھی۔ پھر ۱۸۱۴ء میں ہم دیکھتے ہیں کہ "پریم ساگر" میں پائے جانے والے کھڑی بولی کے الفاظ کے متعلق ایک کتاب "*A Vocabulary, K,haree Boli and English, of the Principal Words Occurring in Prem Sagar*" کے عنوان سے سامنے آئی۔ اسے لیفٹیننٹ ولیم پرائس نے شایع کروایا تھا جو خود بھی فورٹ ولیم کالج میں سنسکرت اور بنگالی زبانوں کے پروفیسر تھے۔ ("*ACF*"، ص ۲۸)۔

۳ ایک دل چسپ بات یہ ہوئی کہ ۱۹۳۳ء میں ایک جاپانی صاحب نے کسی جاپانی میگزین کے لیے ایک مضمون تحریر کیا جس کا موضوع تھا: "ہندوستانی زبان"۔ اس مضمون میں لکھا تھا کہ: "یہ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کی زبان کا مطلب کبھی بھی صرف 'ہندوستانی' زبان نہیں رہا، لیکن زیرِ نظر مضمون میں ہندوستان کی زبان کا مطلب صرف 'ہندوستانی' ہی لیا گیا ہے۔" آگے لکھا تھا کہ: "اردو زبان کا مطلب ہوا: فارسی زبان کی چھاپ چڑھی ہندوستانی زبان۔" یہ سولھویں صدی کے آخر میں ادبی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ بعد میں یہ رابطے کی زبان قرار پائی اور اس کے بعد یورپی علما و ادبا کے گہرے مطالعے کے بادل اس زبان کی سرزمیں پر چھا گئے (آئینو، ۱۹۳۳ء، ص ۳۲-۳۳)۔

۴ عام طور پر یہی نظریہ رائج تھا کہ کھڑی بولی کو "ہندی" تب کہا جائے گا جب اس میں سنسکرت سے اخذ کیے جانے والے الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا جائے گا۔ عقیل صاحب نے اس بات کی وضاحت (۱۹۹۴ء، ص ۲۰۱) یوں پیش کی ہے کہ ہندوستان میں صوفیائے کرام نے اپنی شاعری و نثر کو پیش کرنے کے لیے چوں کہ فارسی۔ عربی رسم الخط کو منتخب کیا، لہٰذا اردو زبان کا دائرہ وسیع تر ہوا اور اس نے بے شمار عربی و فارسی الفاظ کامیابی کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹ لیے۔ "فرہنگ

آصفیہ'' کے آخری صفحات میں مولوی سید عبداللہ کی مرتب کردہ لغت کا ذکر بھی اسی نکتے کی جانب توجہ دلاتا ہے۔اس لغت کو ۱۹۰۱ء میں مولوی سید عبداللہ نے ۵۴۰۰۹ (چون ہزار نو) الفاظ کی مدد سے مرتب کیا۔ان کی لغت میں دو باتیں نمایاں تھیں۔اوّل تو یہ کہ انھوں نے پنجابی زبان سے تعلق رکھنے والے الفاظ کو بھی ہندی کے الفاظ قرار دے دیا۔پنجابی الفاظ کی شمولیت کے بعد ہندی الفاظ کی کل تعداد ۲۱۶۴۴ (اکیس ہزار چھ سو چوالیس) ہوگئی۔دوم یہ کہ انھوں نے غیر ہندی زبانوں سے اخذ ہو کر ہندی میں شامل ہونے والے الفاظ کو اردو کے الفاظ قرار دیا۔ان کی اس تعریف کے بعد اردو کے الفاظ کی تعداد ۱۷۵۰۵ (سترہ ہزار پانچ سو پانچ) ہوگئی۔اس طرح ہندی الفاظ لغت کے کل الفاظ کا چالیس فیصد جب کہ اردو الفاظ تقریباً ساڑھے بتیس فیصد تھے۔صرف ساڑھے سات فیصد الفاظ کا فرق ایسا نہ تھا کہ ان کی لغت کو ہندی زبان کی لغت قرار دیا جائے۔دیگر زبانوں کے الفاظ کی تعداد یہ تھی: عربی کے ۷۵۸۴ (سات ہزار پانچ سو چوراسی) الفاظ، فارسی کے ۶۰۴۱ (چھ ہزار اکتالیس) الفاظ، سنسکرت کے ۵۵۴ (پانچ سو چون) الفاظ، انگریزی کے ۵۰۰ (پانچ سو) الفاظ، ترکی کے ۱۰۵ (ایک سو پانچ) الفاظ، یونانی کے ۲۹ (انتیس) الفاظ، پرتگالی کے ۱۶ (سولہ) الفاظ، عبرانی کے ۱۱ (گیارہ) الفاظ، سُریانی کے ۷ (سات) الفاظ، رومی کے ۴ (چار) الفاظ، فرانسیسی کے ۳ (تین) الفاظ، براہما کے ۲ (دو) الفاظ جب کہ مالابار اور اسپینی زبانوں کا ایک ایک لفظ شامل تھا۔یہ بات واضح رہے کہ دہلوی صاحب نے فارسی الفاظ کے ساتھ ساتھ ہندی-فارسی الفاظ کو بھی فارسی زبان کے الفاظ قرار دیا تھا۔کسی بھی زبان کے الفاظ واضح طور پر اکثریت حاصل نہ کر سکے، حتی کہ اگر اردو، عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ جمع بھی کر لیے جائیں تو کل ۳۱۲۳۵ (اکتیس ہزار دو سو پینتیس) الفاظ بنتے ہیں جو لغت کے کل الفاظ کا تقریباً اٹھاون فیصد بنتے ہیں لیکن اب بھی ہندی کے مقابلے میں اس لغت کو اردو کی لغت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ڈاکٹر جان بارتھوک گل کرسٹ ایڈنبرا (برطانیہ) میں پیدا ہوئے۔ہندوستان میں ان کی آمد ایک سرجن کے معاون کے طور پر ہوئی تھی۔۱۷۸۵ء میں انھوں نے شمالی ہندوستان کا سفر کیا اور ''ہندوستانی'' زبان کا مطالعہ کرنے کی غرض سے فتح گڑھ، فیض آباد اور غازی پور کے علاقوں کا دورہ کیا۔اس دورے کی نوعیت خالصتاً تحقیق پر مبنی تھی۔دو سال بعد انھوں نے غازی پور میں اپنے قیام (۱۷۵۷ء-۱۷۹۵ء) کے دوران نیل کے پودے کی کاشت سے متعلق اصطلاحات کو مرتب کرنا شروع کیا اور ان اصطلاحات کو ہندوستانی زبان میں ایک لغت کی صورت میں پیش کیا۔پھر ہندوستانی زبان میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ تین سال بعد (۱۷۹۸ء) میں حکمران ایسٹ انڈیا کمپنی نے انھیں ''ماہر زبان ہندوستانی'' منتخب کیا اور اگلا سال شروع ہوتے ہی (جنوری ۱۷۹۹ء) انھیں کم درجہ کے حامل سرکاری خدمت گاروں کو ''ہندوستانی'' زبان کی تعلیم دینے پر مامور کیا۔یہ تعلیم ''اورینٹل سیمیناری'' میں دی جا رہی تھی جسے قائم ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔نئی صدی کا پہلا سال شروع ہوتے ہی (۱۸۰۰ء میں) انھیں کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ''شعبۂ ہندوستانی'' کے پروفیسر کا منصب سنبھالا۔چار سال بعد (۱۸۰۴ء) میں وہ ایڈنبرا واپس چلے گئے جس کے پانچ سال بعد (۱۸۰۹ء) میں ان کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کا دورانیہ ختم ہو گیا۔اب وہ ریٹائرڈ تھے۔جب انھوں نے ایڈنبرا سے ہجرت کی اور لندن میں سکونت اختیار کی تو انھیں لیسٹر اسکوئر کے علاقے میں قائم ''اورینٹل انسٹی ٹیوٹ'' میں

۵

ہندوستانی زبان کے پروفیسر کے منصب کی پیشکش ہوئی جو انھوں نے تھوڑے عرصے کے لیے قبول کر لی۔ زندگی کے آخری ایام انھوں نے پیرس (فرانس) میں گزارے ("DNB"، ص ۱۲۲۱)۔ ان کی تصانیف میں چند اہم نام یہ ہیں:

۱۔ "A Dictionary, English and Hindoostanee"، دو حصوں میں، ۱۷۸۷ء-۱۷۹۰ء، کلکتہ۔

۲۔ "A Grammar of the Hindoostanee Language, with a Supplement"، ۱۷۹۶ء، کلکتہ۔

۳۔ "The Oriental Linguist"، ۱۷۹۸ء، کلکتہ۔

۴۔ "The Antijargonist or a Short Introduction to the Hindoostanee Language"، ۱۸۰۰ء، کلکتہ۔

"Hindoostanee Philology, Comprising a Dictionary, English and Hindoostanee, also Hindoostanee and English, with a Grammatical Introduction"، ۱۸۰۱ء، ایڈنبرا۔

"The Hindee Story Teller or Entertaining Expositor of the Roman, Perian and Nagree Characters, Simple and Compound, in Their Application to the Hindoostanee Language the Hindoostanee Language, as a Written ad Literary Vehicle"

۱۸۰۳ء، کلکتہ، ہندوستانی پریس۔

۷۔ "Hindee Moral Preceptor"، ۱۸۰۳ء، کلکتہ۔

۸۔ "Hidayat ool Islam in Arabic and Hindoostanee"، ۱۸۰۴ء، کلکتہ۔

۹۔ "The Antijargonist, Stranger's Guide, Oriental Linguist"، ۱۸۰۶ء، ایڈنبرا۔

۱۰۔ "The Hindee-Roman Orthoepigrapical Ultimatum"، ۱۸۲۰ء، لندن۔

۱۱۔ "Dialogues, English and Hindoostanee: for Illustrating the Grammatical Principles of the Stranger's East Indian Guide"، ۱۸۲۶ء، لندن۔

۶ فیوجی تاکیشی نے اس نکتے کی جانب اشارہ کیا کہ اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ کیا لفظ ''ہندوستانی'' دیسی بولی میں استعمال کیا جاتا تھا، یا پھر اس لفظ کو پہلے پہل یورپ سے آئے ہوئے لوگوں ہی نے استعمال کیا۔ یولی اور برنل نے جب دیکھنا شروع کیا کہ یورپی لوگوں نے ''ہندوستانی'' کا لفظ کب سے استعمال کرنا شروع کیا تو اس ضمن میں ان کے سامنے اوّلین مثال مشہور پرتگالی تاریخ دان '' زیواؤ دی بَروس'' (جو ''بروس'' کے نام سے مشہور ہے) کی آئی جس نے ۱۵۵۳ء میں یہ لفظ استعمال کیا (یولی اور برنل، ۱۹۸۶ء، ص ۴۱۶)۔ ایک اور مثال پلٹس کے یہاں بھی ملتی ہے جس نے یہ تحقیق پیش کی کہ اس لفظ ''ہندوستانی'' کو کئی لوگوں نے اتفاقیہ طور پر استعمال کرنا شروع کیا تھا جس سے ان افراد کی مراد ''اردو زبان'' ہوا کرتی تھی (پلٹس، ۱۸۸۴ء، ص ۱۲۳۶)۔ اسی طرح پلٹس نے اپنی گرامر میں ''ہندوستانی'' اور ''اردو'' کو ایک ہی زبان قرار دیا (پلٹس، ۱۹۰۹ء)۔ اس مقام پر گرائرسن کے نظریہ کا مطالعہ کریں تو وہ مختلف نظر آتا ہے۔ اس نے "Linguistic Survey of India" میں یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کی دیسی زبان

یہی ''ہندوستانی'' تھی۔ اس نے اس ضمن میں مغربی روہیل کھنڈ، بالائی گنگا تک دوآب اور انبالہ کے پنجاب کے اضلاع کا ذکر کیا ہے جہاں یہ ''ہندوستانی'' زبان بولی جاتی تھی۔ مزید یہ بھی تحریر ہے کہ ''ہندوستانی'' زبان کو تو ہندوستان کے مسلمان اور ہندو، دونوں قومیں ہی ادبی مقاصد اور باہمی روابط کے لیے استعمال کرتی تھیں جب کہ ''اردو'' زبان اس خطے میں رابطے کی واحد زبان نہ تھی۔ اردو کو کثرت سے مسلمان استعمال کیا کرتے تھے یا پھر وہ ہندو جنھوں نے مسلمانوں کا وضع کردہ نظام تعلیم اختیار کیا ہوا تھا۔ یہ بھی ذکر موجود ہے کہ ایک جدید شکل ''ہندی'' زبان کی صورت میں بھی موجود تھی اور اسے صرف ہندو قوم کے وہ لوگ استعمال کرتے تھے جو ہندوانہ نظام تعلیم سے فارغ التحصیل تھے (گرائرسن، ۱۹۲۱ء، ص ۱)۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ مغربی ہندی لکھنے کے لیے دو رسوم الخط استعمال کیے جاتے تھے۔ اول تو فارسی رسم الخط تھا جو بہت حد تک ''ہندوستانی'' کے الفاظ لکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا جب کہ دیگر بولیوں کے الفاظ دیوناگری رسم الخط میں لکھے جاتے تھے (گرائرسن، ۱۹۲۱ء، ص ۳)۔

۷ لاطینی زبان میں ''لنگوا ہندوستانیکا'' (*Lingua Hindostanica*) جب کہ جرمن زبان میں ''ہندوستانیش'' (*Hindostanische*) یا ''اندوستانیکم'' (*Indostanicum*) کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ (احمد، نذیر، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸-۲۰؛ جین (ودیگر)، ۱۹۹۸ء، ص ۵۰-۵۱)۔

۸ ابن بطوطہ نے دریائے سندھ کے زیریں علاقے سے لے کر ملتان تک کی زمین کو ''سندھ'' کے نام سے پکارا ہے جب کہ دریائے ستلج کے مشرق کی جانب پھیلی ہوئی سرزمین کو ''ہند'' لکھا ہے (یاجی ما، ۱۹۹۹ء، ص ۳۰۲)۔

۹ ہیڈلے نے وضاحت سے لکھا ہے کہ ''جنتو'' (جمع: جنتوس) مسلمانوں کی فتح سے قبل تک بت پرست تھے (ہیڈلے، ۱۹۷۶ء، ص ۳-۴)۔ انیسویں صدی میں ''جنتو'' کا لفظ بدل کر ''ہندو'' ہو گیا (فیوجی، ۲۰۰۲ء، ص ۶۶) اور پھر اس لفظ ''ہندو'' کو ہندو مذہب اور ہندو قوم کے افراد کے لیے استعمال کیا جانے لگا (فیوجی، ۲۰۰۲ء، ص ۴۷)۔ کچھ یورپیائی لوگوں نے ''ہندوستانی'' زبان کے لیے ''جرگون'' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

۱۰ گل کرسٹ کا نظریہ ہمیشہ سے یہی رہا کہ ''ہندوستانی'' ایک زبان کا نام ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ ''ہندوستان'' کا مطلب سمجھانے کے لیے اسے انگریزی میں "India" لکھا اور پھر آگے رومن طریقے میں اسے "*Hindoo-stan*" لکھا، یعنی "*-stan*" کو لاحقہ بنا کر لکھا۔ پھر اسے یوں پڑھا: ''ہندوستان: ہندو- سرزمین''۔ چوں کہ اس ترجمے کا واحد اور واضح مقصد لاحقہ (*-stan*) کا مفہوم واضح کرنا تھا، لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ گل کرسٹ نے ہندوستان کے لیے ہندوستان کا لفظ صرف قارئین کو آسانی سے اپنی بات سمجھانے کی غرض سے لکھا تھا۔

۱۱ یہ اقتباس مارکوئیس ولزلی کے تیار کردہ نکات میں سے اخذ کیا گیا ہے جو انھوں نے ۱۸۰۵ء میں فورٹ ولیم کالج کی کونسل میں پیش کیے۔

۱۲ یہ اقتباس جریدہ "Asiatic Researches" کے ساتویں شمارے (ص ۲۳۳) میں ایچ۔ ٹی۔ کالبروک نے تحریر کیا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی کتاب میں اس کا حوالہ دیا۔

۱۳ چند ایک مقامات پر ''ہندوی'' کا لفظ عوامی سطح پر رائج ایک زبان کے لیے بھی استعمال ہوا ہے لیکن گل کرسٹ نے

وضاحت کی ہے کہ ''ہندوی'' زبان مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی رائج تھی اور یہ ہندوستان کی قدیم زبان تھی۔ گویا یہ زبان واضح طور پر صرف ہندوؤں کی میراث ہے ("OL"، ۱۷۹۸ء، ص ۳-۴)۔ اسی کتاب میں آگے چل کر گل کرسٹ نے اسی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے تلسی داس اور سُر داس کے ناموں کو ''بھاکا'' یعنی خالص ہندوستانی شاعروں کے ناموں کے طور پر پیش کیا ہے ("OL"، ۱۷۹۸ء، ص ۳۳۵)۔ ان دونوں شعراء کا کلام بھی اس وقت صرف دیوناگری زبان میں ہی موجود تھا جو ''بھاشا'' زبان بھی کہلاتی تھی (جین (ودیگر)، ۱۹۹۸ء، ص ۵۳)۔

۱۴ میر محمد تقی میرؔ نے ۱۷۴۳ء (بمطابق ۱۱۶۵ھ) کے آس پاس ''نکات الشعرا'' لکھی۔ میرؔ نے اپنی اس تصنیف کے پیش لفظ میں ایک جملہ تحریر کیا ہے: ''زبان اردوئے معلّٰی شاہ جہان آباد دہلی'' (حق، ۱۹۳۵ء، ص ۹)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کسی مخصوص علاقے کا نام ہے۔ اس کے برعکس زبان کے لیے انھوں نے ''ریختہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے (حق، ۱۹۳۵ء، ص ۷)۔ نیز میرؔ ہی کے متعلق ایک دوسری کتاب ''ذکرِ میرؔ'' میں بھی ''زبان اردوئے معلّٰی بادشاہِ ہندوستان'' کا جملہ موجود ہے (حق، ۱۹۳۵ء، ص ۷)۔

۱۵ چغتائی نے وضاحت کے ساتھ اس بات کو بیان کیا ہے کہ نظم ''لکھا تاریخ حاتف نے کھلا ہے باغ مائلؔ کا'' کے آخری شعر پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ شعر ۱۷۶۰ء بمطابق ۱۱۷۶ھ میں لکھا گیا، اگرچہ ابجد میں صرف ۱۱۷۶ کا ہندسہ لکھا ہوا ہے۔ لیکن ۱۱۷۶ھ کو اگر سن عیسوی میں تبدیل کیا جائے تو یہ ۱۷۶۰ء کے بجائے ۱۷۶۲ء-۱۷۶۳ء کا عرصہ بنتا ہے۔ ابجد سے لگائے گئے اس حساب کی وجہ یہ ہے مائلؔ کے لکھے گئے اس شعر میں سن عیسوی کا حساب، دسویں صدی ہجری کے مطابق آنا چاہیے تھا (جین (ودیگر)، ۱۹۹۸ء، ص ۶۵)۔

۱۶ عروض کے اصولوں کے مطابق ''شاہ جہان'' کو ''شاہِ جہان'' پڑھا جاتا ہے۔

۱۷ محققینِ اُردو کے درمیان ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ مصحفی نے یہ شعر ۱۷۷۶ء میں لکھا تھا (جین (ودیگر)، ۱۹۹۸ء، ص ۵۵)۔

۱۸ ریشی گاموتے ''باغ و بہار'' کا جاپانی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۴۰ء میں شایع کروایا۔ یہ ترجمہ ۱۹۹۰ء میں دوبارہ شایع ہوا ہے۔

۱۹ مثال کے طور پر ۱۸۰۳ء میں شایع ہونے والی ایڈیشن میں یہ فقرہ: ''درد سے تڑپنے لگا''، تبدیل ہو کر ''درد سے بے قرار ہونے لگا'' تحریر کیا گیا۔ اسی طرح اس فقرے کو ''کرم کی ریکھا مٹی نہیں، ان آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا'' بہتر موسیقانہ انداز میں تحریر کرنے کی غرض سے ''مٹی نہیں کرم کی ریکھا، ان آنکھوں کے سبب یہ کچھ دیکھا'' سے تبدیل کر دیا گیا تھا (خان، رشید حسن، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۵)۔ نیز انھوں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ یہ تبدیلی میر شیر علی افسوسؔ نے کی تھی اور انھی کی محنت کی وجہ سے ہندوستانی زبان کا ہر ایک طریقہ اظہار ''باغ و بہار'' میں شامل ہوا (خان، رشید حسن، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۴)۔ افسوسؔ بھی چوں کہ میر امن کی طرح فورٹ ولیم کالج کے ملازم تھے، لہٰذا فطری طور پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ افسوسؔ نے یہ تبدیلی ضرور گل کرسٹ کے اشارے پر ہی کی ہوگی۔

۲۰ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے اپنے اس وضاحتی بیان میں ''کایست'' کو شامل نہیں کیا جو مغلیہ دربار میں فارسی زبان لکھ اور پڑھ سکتا تھا۔

۲۱ اردو زبان کا ایک محاورہ ہے: ''شین قاف درست ہونا''۔ اس کا مطلب ہے ''تلفظ کرنے کے لیے درست طریقہ برائے

ادائیگی تلفظ استعمال کرنا'' (سرہندی، ۱۹۹۰ء، ص ۹۶۹)۔ اس محاورے کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ جب تلفظ کرتے تھے تو کچھ ایسے الفاظ بھی تھے جن کی ادائیگی کا طریقہ مشکل تھا۔

۲۲ ''دریائے لطافت'' نو (۹) ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں صرف نواں باب مرزا محمد احسن قتیل نے لکھا تھا' بقیہ اوّل تا آٹھ ابواب' انشا نے تحریر کیے۔

۲۳ چاندنی چوک میں واقع فتح پور مسجد کے قریب ہی ایک تالاب کے پاس چند تعمیر شدہ رہائش گاہیں تھیں۔ ان رہائش گاہوں میں علم وفن کے ماہر افراد رہائش پذیر تھے، نیز مسافر بھی ان رہائش گاہوں میں قیام کرلیا کرتے تھے (فیونو' یامانے (و دیگر)، ۲۰۰۸ء: ص ۱۹۷)۔

۲۴ انشا نے ایک اور نظریہ بھی پیش کیا کہ اردو کا مطلب ہے وہ علاقہ جو کابلی دروازہ سے لے کر وہاں تک پھیلا ہوا تھا جہاں شاہ خدایار کا تکیہ تھا۔ اس میں نواب شبیر جنگ (مرحوم) اور نواب سعادت خان کے محلات بھی شامل تھے اور حبش خان کے محل کا دیوقامت دروازہ بھی شامل تھا (انشا، ۱۹۳۵ء: ص ۳۶-۳۷)۔

۲۵ پروفیسر کٹسورو گوگا نے ''دریائے لطافت'' میں بیان کی جانے والی تمام ضرب الامثال کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے (گوگا، ۱۹۷۷ء)۔

۲۶ ہمیں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ انشا کے دور میں ''شاہ جہان آباد'' کا علاقہ' دہلی شہر کی چار دیواری کے اندر ہی موجود تھا (ایلرس' کرافٹ (ودیگر)، ۱۹۹۳ء)۔ پہلے پہل دہلی شہر کے گرد چھوٹے بڑے پتھروں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک چار دیواری بنا دی گئی تھی، لیکن بعد میں ۱۶۵۱ء-۱۶۵۸ء کے عرصے کے دوران شہر کے گرد باقاعدہ آٹھ میٹر بلند اور تین اعشاریہ چھ میٹر چوڑی مضبوط چٹانی دیوار تعمیر کی گئی (فیونو، یامانے، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۷)۔ ''شاہ جہان آباد'' کو بسانے کا سہرا ''شاہ جہان'' کے سر جاتا ہے جس نے لاہور اور آگرہ کے شہروں کے درمیان ایک دارالحکومت بنانے کا حکم صادر کیا تھا۔ اس سے قبل بھی لاہور یا آگرہ شہر میں دارالحکومت بنائے جانے کا منصوبہ بنا تھا لیکن ان دونوں شہروں کی نہایت گنجان آبادی اس میں رکاوٹ بن گئی۔ شاہ جہان چاہتا تھا کہ اصفہان کے شہر کی طرز پر نہایت منصوبہ بندی کے ساتھ ایک بالکل نئے شہر کی تعمیر کیا جائے (فیونو، یامانے، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۸)۔ لہٰذا شاہ جہان نے لاہور اور آگرہ کے شہروں کو چھوڑ کر ''دین پناہ'' اور ''فیروز آباد'' کی شمالی سمت میں ''شاہ جہان آباد'' کا شہر تعمیر کیا۔ شہر کا نقشہ استاد حامد اور استاد احمد نے تخلیق کیا۔ شاہ جہان آباد کی چند تصویروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی چار دیواری سے باہر بھی کچھ رہائشی عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ یہ شہر ارد گرد کی آبادیوں سے بالکل ہٹ کر تعمیر کیا گیا تھا۔ لہٰذا دیواروں میں گھرا ہوا جغرافیائی طور پر الگ تھلگ یہ شہر اس بات کی جانب بھی ہماری توجہ دلاتا ہے کہ شاہی محلات میں بولی جانے والی زبان دیگر بولیوں سے مختلف کیوں کر تھی۔

۲۷ ان کی کتاب "*Hindoostanee Philology*" کے آغاز میں ہی ہندوستانی زبان کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے کہ ''یہ وہ زبان تھی جسے برطانوی حاکمیت میں ہندوستان کے ہر طبقے کے افراد بول چال کے لیے استعمال کیا کرتے تھے'' ("HP")۔ ایک اور مقام پر انھوں نے زبان کی جغرافیائی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ وہ زبان زیادہ

مقبول اور قابل فہم ہوتی ہے جو دربار میں جگہ پاتی ہے اور جو گنجان آباد شہروں کے گلی کوچوں میں پھرا کرتی ہے، چاہے ملکی سرحدوں میں کتنی ہی توسیع ہو جائے یا ملکی سرحدوں کے اندر کتنی ہی چھوٹی بڑی بولیاں کیوں نہ مستعمل ہوں ("SEH"، ص ۲۰)۔ اسی صفحے پر آگے لکھا ہے کہ "عظیم رقبے پر پھیلے ہوئے ملک ہندوستان میں بہ مشکل ہی کوئی ایسا مسلمان ملے گا جو ہندوستانی زبان کی سمجھ نہ رکھتا ہو اور اس زبان میں گفتگو نہ کر سکتا ہو" ("SEH"، ص ۲۰)۔ ہندوستانی زبان کی افادیت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے گل کرسٹ نے لکھا کہ "ہندوستان کے تقریباً تمام معاشرتی طبقوں میں اس (ہندوستانی زبان) کی عالم گیری حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اس زبان کا نثری اور شعری ادب بھی وجود میں آتا جا رہا ہے، تاہم ادبا حضرات اپنے اپنے علاقوں کی بولیوں کا فہم بھی بہ درجہ اتم رکھتے ہیں کیمپ کو مورین سے کابل کے راستے میں آنے والا، دریائے گنگا کے کنارے دو ہزار میل لمبا اور چودہ سو میل چوڑائی کے عظیم رقبے پر پھیلا ہوا یہ ملک لسانی طور پر ایسی حیثیت رکھتا ہے کہ کسی بھی گاؤں یا قصبے میں چند ہی لوگ ایسے ملیں گے جو مسلمانوں کے زیر اثر یا مسلمانوں کی آبادیوں میں نہ رہے ہوں اور ہندوستانی زبان کی سمجھ نہ رکھتے ہوں، ورنہ تو دریائے گنگا کی حدود کے اندر بیش تر علاقوں میں یہی ہندوستانی زبان ہی رائج ہے اور عوامی سطح پر مستعمل ہے۔" پھر گل کرسٹ نے ہندوستانی زبان کو سرکاری سرپرستی میں دیے جانے کی حمایت میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ "یہی زبان حکومتی نظم و نسق، کاروباری معاملات، فوجی معاملات اور عدل و انصاف کے معاملات چلانے کے لیے موزوں ترین بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی ("SEH"، ص ۲۱-۲۲)۔ گل کرسٹ کے اس بیان سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیان کردہ وضاحت کا مقصد صرف ہندوستانی زبان کی افادیت بیان کرنا ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس نکتے کی جانب بھی توجہ دلانا چاہتے تھے کہ ہندوستانی زبان پر مسلمانوں کے اثرات کس حد تک پڑے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے مختلف زبانیں مخصوص کرنے کا حکم صادر کیا۔ مثال کے طور پر بنگال، بہار، اڑیسہ اور بنارس کے علاقوں میں جج حضرات کے دفاتر میں اور ہر نوعیت کی عدالت میں فارسی اور ہندوستانی زبان کو سرکاری امور کی انجام دہی کے لیے رائج کرنے کا حکم ہوا۔ اسی طرح بنگال اور اڑیسہ کے علاقوں میں محصولات کی وصولی کے دفاتر، بندرگاہوں، کاروبار کی غرض سے قائم کی جانے والی سرایوں اور نمک کے ایجنٹوں کے لیے بنگالی زبان کو رائج کرنے کا حکم صادر کیا گیا۔ اسی طرح بنگال میں تعینات جج حضرات کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اپنے متعلقہ صوبے کی زبان بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی سرکاری طور پر اس بات سے بھی منع نہیں کیا جاتا تھا بنگال کے کلکٹر حضرات اپنی سہولت دیکھتے ہوئے بنگالی زبان میں فارسی اور ہندوستانی زبان کے الفاظ شامل کر لیں۔ اسی طرح بنارس اور بہار کے اضلاع میں محصولات کی وصولی کے دفاتر میں، بندرگاہوں پر، کاروبار کی غرض سے قائم کی جانے والی سرایوں اور نشہ آور ہیروئن کی ترسیل کے ایجنٹوں کے لیے سرکاری طور پر ہندوستانی زبان کو رائج کیا گیا تھا ("SEH"، ص ۲۷)۔

۲۸ اٹھارویں صدی کے اختتام پر جب گل کرسٹ ہندوستان تشریف نہیں لائے تھے، تب برطانوی یہ سوچتے تھے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامی معاملات چلانے کے لیے فارسی زبان موزوں رہے گی۔ لہٰذا ۱۷۸۰ء میں عوامی سطح پر ایک اعلان کیا گیا کہ آکسفرڈ یونیورسٹی میں فارسی زبان کے ماہر کی ضرورت ہے۔ اس اعلان سے فارسی

زبان کی تہذیبی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی انتظامی افادیت بھی نمایاں ہو جاتی ہے (رحمان، ۲۰۰۴ء، ص ۱-۷)۔

۲۹ برٹش لائبریری میں فورٹ ولیم کالج کے ریکارڈ میں چند ایسے کاغذات بھی محفوظ ہیں جن میں گل کرسٹ نے اپنی آرا تحریر کی ہیں۔ گل کرسٹ نے اپنی اس تحریر میں ایک مقام پر عربی اور فارسی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے اقتباس میں ایک جگہ ''عربی'' اور ''فارسی'' کے الفاظ مٹا کر ''ہندوستانی'' لکھا ہے۔

۳۰ یامانے نے ''سحر البیان'' کے پہلے حصے کو جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے (یامانے، ۲۰۰۱ء)۔

۳۱ تاکامتسو ماتسومورا نے میر کی منتخب غزلیات کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے (متسومورا، ۱۹۹۶ء)۔

۳۲ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہیڈلے نے محض علاقائی لوگوں سے گفتگو کرنے کی غرض سے یہ کتاب تحریر کی تھی۔ اس کے پیش نظر قواعد کے اصولوں کا مطالعہ نہ تھا۔ اسی لیے اس نے اپنی زیر بحث تصنیف میں صرف پانچ مصمتات شامل کی تھیں جب کہ کوزی مصمتات کو اس نے واضح نہیں کیا ساتھ ہی اس نے کلمہ وصل کی تمام اصناف کو ایک ہی طرح بیان کیا، مثلاً ''ہم ہوئے، ہم لوگ ہوئے، تم ہوئے، تم لوگ ہوئے، وہ لوگ، وہ لوگ ہوئے، ہم تھے، ہم لوگ تھے، تم تھے، تم لوگ تھے، وہ تھے، وہ لوگ تھے'' (ہیڈلے، ۱۷۹۶ء، ص ۱۶-۲۰)۔

۳۳ ولزلی نے اپنے خط میں لکھا: ''حقیقت یہ ہے کہ جناب گل کرسٹ کے بیان کردہ اسباق خصوصی طور پر ہندوستانی زبان کے قواعد سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایسے ان تھک اور قابل آدمی کو بنیادی طور پر فارسی زبان کا استاد سمجھنا غلطی ہوگی کیوں کہ اس کے زیر نگرانی چند طلبا کی فارسی زبان کی معلومات محض ابتدائی درجے کی ہیں۔ جب کہ جولائی ۱۸۰۰ء میں منعقد ہونے والے امتحانات کے نتائج گل کرسٹ کے زیر نگرانی ہندوستانی زبان کی تدریس پر مامور اساتذہ کی کارکردگی اور اس کے مقابلے میں فارسی زبان کے قواعد کی تدریس کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ سول خدمت گاروں کو اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف ہندوستانی زبان کی تدریس، بلکہ علم کی ہر اس شاخ کی مستقل تدریس کو جن سے سول خدمت گاروں کی عوامی ذمہ داریاں منسلک ہیں، افادیت کے وسیع میدان فراہم کے گی۔ دسمبر ۱۷۹۸ء میں میرے تحریر کردہ نکات کے اصل مسودے جس میں واضح طور پر میں نے جناب گل کرسٹ کو کوئی منصب دینے کی سفارش کی تھی اور ساتھ ہی ان کے زیر نگرانی اساتذہ کے آئندہ ہونے والے امتحان کی جانب بھی توجہ دلائی تھی، میں ایک بار پھر ذاتی طور پر آپ کی اس جانب توجہ کی درخواست کرتا ہوں، بالخصوص اس امر کی جانب کہ جناب گل کرسٹ کا وضع کردہ طریقہ تدریس کس قدر مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔'' ("CFW"، ص ۸۰-۸۱)۔

۳۴ جولائی ۱۸۰۱ء میں چھتیس (۳۶) طلبا ہندوستانی زبان جب کہ ستائیس (۲۷) طلبا فارسی زبان کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اسی سال دسمبر میں دوسری مرتبہ امتحانات منعقد ہوئے جس میں اڑتالیس (۴۸) طلبا نے ہندوستانی، پچاس (۵۰) طلبا نے فارسی، دس (۱۰) طلبا نے عربی جب کہ نو (۹) طلبا نے بنگالی زبان کے امتحان میں شرکت کی۔ پھر جنوری ۱۸۰۴ء میں منعقد ہونے والے امتحان میں ہندوستانی میں اکتالیس (۴۱)، فارسی میں بائیس (۲۲)، بنگالی میں تیرہ (۱۳) جب کہ مراٹھی اور عربی میں پانچ پانچ (۵، ۵) طلبا نے شرکت کی۔ ("ACF"، ص ۱۹-۲۱، ص ۱۷ اور ص ۹۴-۹۵)۔ اس کا مطلب ہوا کہ ہندستانی زبان کی تدریس پر خصوصی توجہ دی جانے لگی تھی۔

۳۵ گرائرسن نے اس میں اپنے اس خدشے کا اضافہ بھی کیا کہ اگر پندرہ سال کی عمر کے لڑکوں کو ہندوستانی زبان میں اس قدر تربیت دی جائے گی تو ایسا نہ ہو کہ شعوری پختگی تک پہنچنے سے پہلے ہی ان لڑکوں کو ہندوستان کی محبت کا مرض لاحق نہ ہو جائے اور یہ اپنے یورپی ثقافتی ورثہ پر فخر کرنے کے بجائے ہندوستان کو ترجیح دینے لگیں، جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کے کئی ملازمین اٹھارویں صدی کے دوران اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں ("EIC"، ص ۶)۔

۳۶ یوں تو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز میں کئی نام اہم تھے لیکن گل کرسٹ نے خاص طور سے چارلس گرانٹ اور ولیم ایسٹل کے نام ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۸۰۱ء میں شایع ہونے والی اپنی تصنیف "Hindoostanee Philology" کے سرورق پر تحریر کروائے ("HP")۔

۳۷ ایسٹ انڈیا کمپنی کالج کے قیام میں "چارلس گرانٹ" کا کردار قابل قدر رہے۔ اس کالج کو ۱۸۰۹ء میں ہیلے بری، برطانیہ منتقل کر دیا گیا اور اب اس کا نام "ہیلے بری کالج" ہے۔

۳۸ I.O. 4780 (ff 51r-53v) فارسی فرہنگ ہیں جو دکن میں مرتب کی گئیں۔ "خوان یغما" (Ethe 3053, 37) ایک فارسی فرہنگ ہے جس میں الفاظ کی وضاحت کے لیے شعری طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ "خالد الفاظِ عجم" (Ethe 2803, ff 38-66) ایک ایسی فرہنگ ہے جس میں ہر فارسی لفظ کا ترجمہ اور وضاحت، دکنی زبان میں کی گئی ہے۔ (OIOC 1411 b.ff 202) بھی ایک فارسی فرہنگ ہے جو دہلی شہر میں لکھی گئی۔ اس میں حروف تہجی کی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے فارسی الفاظ کا اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ (I.O. 4780. 77f) ایک کتاب ہے جس میں اردو ضرب الامثال کی فارسی تشریح کی گئی ہے۔ سب سے زیادہ شہرت کی حامل لغت "تحفۃ الہند" (Ethe 2442, 335) ہے جو اٹھارویں صدی میں لکھی گئی۔ یہ ایک ہندی فرہنگ تھی جس میں ہندی الفاظ کا اردو اور فارسی ترجمہ و تشریح شامل کی گئی تھی۔ "لغت و مصطلاحاتِ طبّ" (Ethe 2377, ff 1v-115) نامی لغت سترہویں صدی میں لکھی گئی۔ اس میں عربی، یونانی اور ترکی طبی تکنیکی اصطلاحات کا فارسی اور اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ (Ethe 3055, ff 60v-100) لغت اٹھارویں صدی میں لکھی گئی۔ اس میں پرندوں، مچھلیوں اور جانوروں کے ترکی اور فارسی ناموں کا دکنی اردو میں ترجمہ اور تشریح کی گئی تھی۔

۳۹ مثال کے طور ایک رپورٹ میں لکھا گیا کہ: "جناب گل کرسٹ کی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد جو بہتریاں سامنے آنے لگیں، وہ نہ صرف ان کی پیشہ ورانہ خدمت کی کامیابی تھی جو اب تک نہایت ہی مؤثر اور کارآمد ثابت ہوئی تھی ...." ("CFW")۔ لیکن اسی جگہ ایک اور ذکر بھی ملتا ہے کہ باہر سے آئے ہوئے چند لوگوں نے طلبا کے اخلاق و کردار کے بارے میں یہ رائے دی کہ گل کرسٹ کی تدریس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ("CFW")۔

۴۰ اس کے علاوہ گل کرسٹ نے "ع" کے استعمال کے لیے "a"، "i" اور "u" پر نقطے لگائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے "ی" کے بلند استعمال کے لیے فارسی۔ عربی حرف "ی" کے سر پر دو نقطے بھی لگائے، جب کہ "ؤ" کے بلند استعمال

کے لیے ''ڈ'' کے سر پر ایک ننھا سا دائرہ بھی بنایا۔ انھوں نے ''اُو'' کی آواز نکالنے کے لیے ''و'' کے سر پر ننھا سا نصف دائرہ لگایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے فارسی۔عربی حروف ''ق''، ''خ''، ''غ''، ''ز''، ''ظ'' اور ''ژ'' کی آوازوں کے لیے دیوناگری کے حروفوں بالترتیب ''k''، ''kh''، ''g''، اور ''j'' کے ساتھ زیریں نقاط کا استعمال کیا۔

۴۱ احمد (۱۹۸۵ء) نے جنوبی ایشیا کی زبانوں کی اشاعت کے پس منظر کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے لیکن کہیں بھی حروف یا اعراب کی نشان دہی نہیں کی ہے۔

۴۲ قدوائی (۱۹۷۲ء، ص۱۰۰) نے اس بات کی جانب اشارہ کیا ہے کہ گل کرسٹ نے زیادہ تر قواعد کا کام ہندوستان کے مشرقی خطے میں کیا۔ اسی لیے ان کے وضع کردہ ہندوستانی زبان کے قواعد میں مشرقی بولی اور لہجے کا نمایاں اثر ہوا۔

۴۳ خان (۱۹۹۲ء، ص۸۴) نے اپنی تصنیف میں گل کرسٹ کے وضع کردہ رسم الخط کا عکس شامل کیا ہے جو ''باغِ اردو'' (سن، ۱۸۰۲ء) میں شایع ہوا تھا۔ ''باغِ اردو'' دراصل فارسی کی مشہور ''گلستان'' کا ہندوستانی ترجمہ تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ گل کرسٹ کا وضع کردہ رسم الخط، کالج کی درسی کتابوں میں شامل ہو چکا تھا۔

۴۴ کالج کی ابتدائی دور اور بعد کی درسی کتابوں میں ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں اعراب کے استعمال میں فرق موجود تھا۔ حسن (۱۸۰۵ء) کے مقابلے میں میر (۱۸۱۱ء) کی کتاب میں اعراب کا استعمال بہت کم کیا گیا۔ لہٰذا یہ بھی ممکن ہے کہ جب گل کرسٹ ہمیشہ کے لیے انگلستان واپس چلے گئے تو مطالعہ کی آسانی کی خاطر اعراب کا استعمال کم ہو گیا ہو اور یوں آئندہ جو کتابیں شایع ہوئیں ان میں اعراب کا استعمال کم ہوا۔

۴۵ ہم اس کی مثال ۱۸۱۹ء میں شایع ہونے والی کالج کی سالانہ رپورٹ میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ نیز فاربس (۱۸۵۱ء) کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ گل کرسٹ کا وضع کردہ رسم الخط ڈنکن فاربس نے اپنا لیا تھا۔

۴۶ ایک اور مثال سے بھی پتا چلتا ہے کہ گل کرسٹ نے الفاظ کی درست ادائیگی کا نظریہ ہمیشہ قائم رکھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے مختلف ناموں مثلاً علاقوں کے نام پر مشتمل ۲۷۱ الفاظ کی فہرست تیار کی۔ یہ وہ الفاظ تھے جنھیں برطانوی غلط بولتے اور لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے وضع کردہ نظام ترسیم میں ان الفاظ کی ادائیگی کا درست طریقہ کار بھی سمجھایا۔ مثلاً برطانوی ''عرب'' کو ''عربیا'' کہتے تھے۔ اسی طرح ''بغداد'' کو ''بغداذ''، ''بنارس'' کو ''بنارس''، ''بنگلہ'' کو ''بینگال''، ''بمبے'' یا ''مبے'' کو ''بومبے''، ''کابول'' کو ''کائبل''، ''قاہرہ'' کو ''کیرو''، ''کلکتہ'' کو ''کیلکٹہ''، ''چین'' کو ''چائنا''، ''مصر'' کو ''اِی جپٹ''، ''ہند'' کو ''ہندوستان''، ''ہندوستان'' کو ''انڈوستان'' جب کہ ''مندراج'' یا ''مدراس'' یا ''چینا پٹم'' کو ''مادراس'' کہتے تھے (''SEH''، ص۱۸۳-۱۸۹)۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی زبان کے ۱۳۰ الفاظ کی فہرست بھی بنائی تھی جنھیں ہندوستانی لوگ غلط تلفظ کرتے تھے، مثلاً ہندوستانی لوگ ''کیپٹن'' کو ''کپتان'' بولا کرتے تھے۔ اسی طرح ''آئین شن'' کو ''تیل شن''، ''جیغرل'' کو ''جنرل''، ''اوفس'' کو ''آفس'' جب کہ ''رپورٹ'' کو ''رپٹ'' کہتے تھے (''SEH''، ص۱۷۹-۱۸۲)۔

مخففات

(۱) *ACF* *"The Annals of the College of Fort William, from the Period of Its Foundation"* کا مخفف ہے۔ تقریباً دو سو سال قبل اسے مارکوئس ولزلی (Marquis Wellesley) نے مرتب کیا تھا اور تھامس روبک (Thomas Roebuck) نے کلکتہ، ہندوستان میں واقع "The Hindoostanee Press" سے شائع کیا تھا۔ (IOR:731, f, 12/ V371) ۔ انٹرنیٹ پر یہ کتاب درج ذیل رابطہ پر مطالعہ کی جاسکتی ہے:

http://www.archive.org (Search Keyword: The annals of the college of Fort William)

(۲) *CFW* "The College of Fort William in Bengal" کا مخفف ہے جسے ۱۸۰۵ء میں لندن سے ٹی۔ کاڈیل (T.Cadell) اور ڈبلیو۔ ڈیوس (W.Davis) نے شائع کیا تھا۔ (IOR:731, l, 13/ V7727)۔ اس ضمن میں مزید مطالعہ کے لیے درج ذیل انٹرنیٹ رابطہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے:

http://www.archive.org (Search Keyword: The College of Fort William in Bengal)

(۳) ***DNB***: یہ کتاب *"The Dictionary of National Biography"* کا مخفف ہے۔ اس کے ایڈیٹرز سر لیسلے اسٹیفن (Sir Leslie Stephan) اور سر سڈنی لی (Sir Sidney Lee) تھے۔ زیر نظر تحقیقی مقالے میں اس کا ساتواں ایڈیشن زیر مطالعہ ہے جسے ۱۸۲۲ء میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں اس کی دوبارہ اشاعت ہوئی۔ انٹرنیٹ پر *"The Dictionary of National Biography"* کے قدیم ایڈیشنز درج ذیل رابطہ پر مطالعہ کے لیے دستیاب ہیں۔ *http://www.archive.arg*

نیز درج ذیل انٹرنیٹ رابطہ پر *"The Dictionary of National Biography"* کی نئی اشاعتوں کے متعلق معلومات موجود ہیں۔ *http://www.oxforddnb.com/public/index.html*

(۴) ***EIC***: یہ ایک تعلیمی ادارے *"East India College, Haileybury"* کا مخفف ہے جو انگلینڈ کی ایک تعلیمی درس گاہ تھی۔ یہ کالج ۱۸۰۶ء سے ۱۸۵۸ء تک قائم رہا (*Records and Records of Other Institutions*، ۱۷۴۹ء–۱۹۲۵ء، لندن، Her Majesty's Stationery Office، (OIOCJ/1-4; K1-3)۔ انٹرنیٹ پر "Her Majesty's Stationery Office (HMSO)" اور *"East India College, Haileybury"* کا مزید مطالعہ بھی موجود ہے۔

(۵) ***HP***: یہ ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ کی تصنیف *"Hindoostanee Philology"* کا مخفف ہے۔ اس کتاب کا پورا نام ہے: *"Hindoostanee Philology: Comprising a Dictionary, English and Hindoostanee, also Hindoostanee and English, with a Grammatical Introduction"*۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں ایڈنبرا، اسکاٹ لینڈ میں واکر (Walker) اور گریگ (Greig) نے شائع کی۔ (OIOC: V4566)۔ انٹرنیٹ پر یہ کتاب درج ذیل رابطہ پر مطالعہ کی جاسکتی ہے:

http://www.archive.org (Search Keyword: Hindoostanee Philology)

(۶) *OL*: یہ ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ کی تصنیف "*Oriental Lingiust*" کا مخفف ہے۔ یہ کتاب ۱۷۹۸ء میں کلکتہ' ہندوستان سے فیرس (Ferris) اور گرین وے (Greenway) نے شایع کی۔ (IOR: 1502/371/1-2) یہ کتاب اب تک انٹرنیٹ کی اوپن لائبریری میں یہ کتاب مطالعہ کے لیے دستیاب نہیں ہے۔

(۷) *PVE*: یہ "*Preliminary View of Establishment*" کا مخفف ہے۔ اس کا پورا عنوان ہے:

" A Preliminary of the Establishment of the Honourable East-India Company Collge in Hertfordshire for the Education of Young Persons Appointed to the Civil Service in India"

یہ وہی کالج ہے جس کا ذکر مخفف نمبر ۴ میں آچکا ہے' یعنی "*East India College, Haileybury*"۔ مذکورہ بالا عنوان دراصل ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ کا تحریری مسودہ ہے جو ۱۸۰۶ء میں کتابی شکل میں شایع ہوا (OIOC/J/I/21, 44-63)۔ انٹرنیٹ پر ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ کا یہ مسودہ کتابی شکل میں درج ذیل رابطہ پر مطالعے کے لیے موجود ہے: *http://books.google.com.pk*

(Search Keyword:Preliminary View of Establishment)

(۸) *SEH*: یہ ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ کی تصنیف *"The Stranger's East India Guide to the Hindoostanee"* کا مخفف ہے۔ اس کتاب کا پورا تعارف درج ذیل عنوان سے کیا گیا ہے:

"The Stranger's East India Guide to the Hindoostanee; or Grand Popular Language of India (Imprperly called Moors) "

یہ کتاب ۱۸۰۸ء میں لندن سے شایع ہوئی (OIOC: T7193)۔ انٹرنیٹ پر ڈاکٹر جان بورتھوک گل کرسٹ کی یہ تصنیف درج ذیل رابطے پر مطالعے کے لیے موجود ہے جسے مذکورہ بالا عنوان کی مدد سے زیر نظر لایا جاسکتا ہے:

http://books.google.com.pk

(Search Keyword:The Stranger's East India Guide to theHindoostanee)

(۹) *TH*: یہ کتاب "تحفۃ الہند (*Tohfat al-Hind*)" کا مخفف ہے (OIOC: ethe 2442, 335f)

فہرست اسناد محولہ

جاپانی زبان کی تصنیفات، جرائد اور شخصیات:

اوایا، توشی، ۱۹۹۸ء، "*Igirisu Shokuminchishihai to Indo Shakai*": (اردو مفہوم: 'برطانوی نوآبادیاتی راج اور ہندوستانی معاشرہ') اور (انگریزی مفہوم: *'British Colonial Rule and Indian Society'*)، ٹوکیو Yamankawa Shuppansha پبلشرز۔

آئینو، فیجی، ۱۹۳۳ء، "*Oujin no Indogo (Hindosutani) Kenkyu ni tsuite*": (اردو مفہوم: 'یورپی اقوام کا مطالعۂ ہندوستانی بطور زبانِ ہند' ۔ایک مضمون) اور (انگریزی مفہوم: *'Note on a Study of Indian*

اور ('انجمن آریہ' :اردو مفہوم) : Ariya Gakki ، (Language (Hindustani) by Europeans'
(انگریزی مفہوم: 'Arian Association') ، اوساکا، Osaka Gaikokugo Gakkou (اردو مفہوم:
'اوساکا یونیورسٹی برائے خارجی مطالعات')۔

فیوجی، تاکیشی، ۲۰۰۲ء، "Kingendai-Indo no Gengo shakaishi" :(اردو مفہوم: 'جدید دور میں
ہندوستان کی سماجی تاریخ کا لسانی مطالعہ') اور (انگریزی مفہوم: 'Linguistic Social History in Modern
India')، مشمولہ "Gendai Minami-Ajia 5, Shakai, Bunka, Jender": (اردو مفہوم: جریدہ 'ہم
عصر جنوبی ایشیا'، شمارہ نمبر۵، 'معاشرہ، تہذیب اور نسل') اور (انگریزی مفہوم: 'Contemporary South Asia,
5, Society, Culture and Gender')، ٹوکیو، Tokyo-daigaku-shuppankai: (اردو مفہوم: ٹوکیو
یونیورسٹی پریس)۔

فیونو، شاجی اور شویامانے، ۲۰۰۸ء، "Mugaru-toshi: Isuramu toshi no Kukan Hen-you" :
(اردو مفہوم: 'مغلوں کی شہری آبادیاں: اسلامی شہروں کی مکانی تبدیلی') اور (انگریزی مفہوم: 'Mughal Cities:
Spatial Transformation of Islamic Cities')، کیوٹو، Kyoto Daigaku
Gakujutsushuppankai: (اردو مفہوم: کیوٹو یونیورسٹی پریس)۔

کوگا، کتسورو، ۱۹۷۷ء، "Dariyae Ratafato ni Shurokusareta Kotowaza ni tsuite" :
(اردو مفہوم: 'دریائے لطافت میں بیان کردہ ضرب الامثال کا ایک مطالعہ') اور (انگریزی مفہوم: 'A Study on the
Proverbs in Darya-e Latafat')، مشمولہ جاپانی جریدہ "Indo Minzoku Kenkyu" :
(اردو مفہوم: 'تحقیقی جریدہ برائے ہندوستانی نسلیات') اور (انگریزی مفہوم: 'Research Journal of Indian
Ethnology')، Osaka Gaikokugo Daigaku (اردو مفہوم: 'اوساکا یونیورسٹی برائے خارجی مطالعات')۔

کونڈو، اوسامو، ۲۰۰۳ء، "Mugaru-chou Indo-shi no Kenkyu" (اردو مفہوم:) اور (انگریزی
مفہوم: 'Studies in the History of Mughal India')، کیوٹو، Kyoto Daigaku
Gakujutsushuppankai: (اردو مفہوم: کیوٹو یونیورسٹی پریس)۔

———، ۲۰۰۶ء، "Toyojin no Indo-kan" :(اردو مفہوم: 'ہندوستان' ایشیائیوں کی نظر میں') اور
(انگریزی مفہوم: 'Image of India by Asians')، ٹوکیو، Kyuko-shoin پبلشرز۔

———، ۲۰۰۸ء، "Akubaru Kaiten ni Mieru Indo no Dentouteki-gakujutsu to
Bukkyo ni tsuite" (اردو مفہوم: 'ہندوستانی آئین اکبری کے حوالے سے روایتی تحقیق اور بدھ مت کا مطالعہ') اور
(انگریزی مفہوم: 'A Study on the Traditional Research and Buddhism of India in
Ain-e-Akbari')، مشمولہ "Bukkyo Daigaku Ajia Shukyo Bunka Jouhou Kenkyusho
Keakyu-kiyou" : (اردو مفہوم: 'بکیو یونیورسٹی کے مرکز برائے مذہبی ثقافت کا تحقیقی جریدہ) اور (انگریزی

مفہوم 'Research Journal of Religious Culture Centre of Bukkyo University' ، شمارہ نمبر۴، کیوٹو ۔

گیمو، ریشی (مترجم) ، یوتا کا اساوا (ترمیم) ،۱۹۹۰ء، *"Miru Amman Yunin no Takuhatsusou no Mongoatari"* : (اردو مفہوم: 'میر امن کی 'باغ و بہار' کا جاپانی زبان میں ترجمہ) اور (انگریزی مفہوم: *'Japanese Tranlation of Mir Amman's Bagh o Bahar'* ،ٹوکیو ، ہے بونشا پبلشنگ کمپنی (ٹویو -بنکو لائبریری'ٹوکیو' جاپان) ۔

ماتسومورا، تاکامتسو، ۱۹۹۶ء ، *"Miru Kyoren Shishu"* : (اردو مفہوم: 'میر تقی میر کی منتخب غزلیات کا جاپانی زبان میں ترجمہ') اور (انگریزی مفہوم *'A Selected Japanese Translation of Mir Taqi Mir's Ghazals'* ، ٹوکیو ، ہے بونشا پبلشنگ کمپنی (ٹویو -بنکو لائبریری'ٹوکیو' جاپان) ۔

منو، ایچی (ترجمہ ومضامین) ،سن ندارد، *"Babur u Nama"* :(اردو مفہوم: 'ظہیر الدین محمد بابر پر لکھی گئی تصنیف ''بابر نامہ'' مع مضامین') اور (انگریزی مفہوم: *'Japanese Translation of Zahir al-Din Muhammad Babur's Babur Nama with Notes'* ،کیوٹو، Shoka-dou پبلشرز۔

ناگا شیما، ہیرومو، ۱۹۸۶ء ، *"Yakushi-chotanwa no Mouru-go ni tsuite-Kinsei Nihon ni okeru Indo Ninshiki no Ichi-sokumen"* : (اردو مفہوم: 'موروں کی زبان کے متعلق ایک مطالعہ مشمولہ'' یاکوشی شوٹنوا'': جدیدیت سے قبل جاپان میں معلوماتِ ہندوستان) اور (انگریزی مفہوم: *'A Study on a Moorish Language in Yakushichotanwa: Knowledgw about India in the Pre-modern Japan'*) ، مشمولہ "Nagasaki-kenritsu Kokusai Keizai Daigaku Ronshu" : (اردو مفہوم: 'ضلع ناگاساکی کا تحقیقی جریدہ 'از یونیورسٹی آف انٹرنیشنل اکنامکس) اور (انگریزی مفہوم 'Research Journal of Nagasaki Prefecture University of International Economics' ،شمارہ۱۹-۴، ناگاساکی، جاپان۔

یاجی ما، ہائیکوئی شی، ۱۹۹۹ء، *"Dai-ryokouki 4"* :(اردو مفہوم: ''ابن بطوطہ کے عظیم سفر کا جریدہ''، مرتب کردہ ابن جوزی، جلد نمبر۴ کا جاپانی زبان میں ترجمہ') اور (انگریزی مفہوم: *'Japanese Translation of The Great Travel Journal by Ibn Battuta, ed. Ibun Juza'i, vol.4'* ، ٹوکیو : ہے بونشا پبلشنگ کمپنی (ٹویو -بنکو لائبریری'ٹوکیو' جاپان) ۔

یامانے، سو ، ۲۰۰۱ء ، *"Johou no Majutsu"* : (اردو مفہوم: 'میر حسن کی تصنیف ''مثنوی سحر البیان'' کی جلد اول کا جاپانی زبان میں ترجمہ) اور (انگریزی مفہوم: *'Japanese Translation of Mathnavi Sihr al-Bayan (first part) by Mir Hasan'* ، مشمولہ "Sekai Bungaku" :(اردو مفہوم: 'عالمی ادب') اور (انگریزی مفہوم: 'World Literature') ، اوساکا، Osaka Gaikokugo Daigaku (اردو مفہوم: 'اوساکا یونیورسٹی برائے خارجی مطالعات')۔

انگریزی اوراردوزبانوں کی تصنیفات، جرائداور شخصیات:

اپٹے، وَمن شیوارام ، ۱۹۵۷ء ، *"The Practical Sansktit-English Dictionary"* (دوبارہ اشاعت ۱۹۸۶ء)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔

احمد، نذیر، ۱۹۸۵ء ، *"Oriental Presses in the World"* ، لاہور، قادر بک ٹریڈرز۔

اسٹین گاس، ایف۔ ، ۱۸۹۲ء ، *"A Comprehensive Persian-English Dictionary"* ، (دوبارہ اشاعت ۱۹۸۱ء) ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۔

امن، میر، ۱۹۹۲ء ، (اولین ایڈیشن ۱۸۵۱ء کی دوبارہ اشاعت)، ''باغ وبہار'' ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔

-------- ، ۲۰۰۶ء ، (مرتب کردہ' سہیل عباس)، ''باغ وبہار'' ، ملتان، بیکن بکس۔

انشا، انشا اللہ خان، ۱۹۳۵ء ، (مراتب: مولوی عبدالحق) ، ''دریائے لطافت'' ، (دوبارہ اشاعت ۱۹۸۸ء)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان۔

ایلرس، اکارٹ اور تھامس کرافٹ، ۱۹۹۳ء ، *"Shahjahanabad: Old Delhi Tradition and Colonial Change"*، (دوبارہ اشاعت ۲۰۰۳ء) ، دہلی، منوہر۔

باون، جان، ۱۹۵۵ء ، *"The East India Campany's Education of its Own Servants"* ، مشمولہ جریدہ "Journal of the Royal Asiatic Society" ، برائے ماہ اکتوبر' ۱۹۵۵ء ، ص ۱۰۵-۱۲۳۔

براس، پال آر۔ ، ۱۹۷۴ء ، *"Language , Religion and Politics in North India"* ، کیمبرج، کیمبرج یونیورسٹی پریس۔

برکی، پیٹر ، ۱۹۹۵ء ، *"Introduction"* ، مشمولہ "Languages & Jargons: Contributions to a Social History of Language" ، ایڈیٹرز ''پیٹر برکی'' اور ''رائے پورٹر''، لندن، پولائٹی پریس۔

پلٹس، ٹی-جان، ۱۸۸۴ء ، *"A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English"* ، (دوبارہ اشاعت ۱۹۹۰ء) ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۔

__________ ، ۱۹۰۹ء ، *"A Grammar of the Hindustani, Urdu Language, fifth impression"* ، (اشاعتِ اول ۱۸۷۴ء، دوبارہ اشاعت ۲۰۰۲ء)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔

جین، گیان چند، سیدہ جعفر، ۱۹۹۸ء ، ''تاریخ ادبِ اردو ۱۷۰۰ء تک''، جلد اول، نیو دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔

چغتائی، اکرام، ۱۹۲۶ء ، ''اردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق''، مشمولہ ''اردو نامہ'' ، ص ۲۶۔

حسن، میر، ۱۸۰۵ء ، *"Sihr-ol-Bayan or Masnuwee of Meer Husun, Being a History of the Prince Benazeer, in Hindoostanee Verse"* ، کلکتہ، فورٹ ولیم کالج۔

حسین، مشتاق، (مراتب)، ۱۹۶۵ء ، حفیظ الدین احمد ، ''خیرد افروز'' ، لاہور، مجلس ترقی ادب۔

حق، عبدالحق، (مراتب)، ۱۹۳۵ء ، انشا، انشاالله‌خان، ''دریائے لطافت''، (دوبارہ اشاعت ۱۹۸۸ء)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان۔
خان، سرسید احمد، ۱۸۷۳ء ، "Cause of the Indian Revolt: Three Essays" ،(مرتب کردہ: سلیم الدین قریشی)، (دوبارہ اشاعت ۱۹۹۷ء)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔
خان، رشید حسن، (مراتب)، ۱۹۹۲ء ، ''باغ و بہار' میرامن دہلوی''، لاہور، نقوش۔
داس، سیسر کمار، ۱۹۷۸ء ، "Sahibs and Munshis: An Account of the College of Fort William" ،کلکتہ ۔
دہلوی، مولانا سید احمد، ۱۹۰۱ء ، ''فرہنگِ آصفیہ''، ص ا-۴، (دوبارہ اشاعت ۱۹۸۷ء)،لاہور، اردو سائنس بورڈ۔
رابنسن ، فرانسس، ۱۹۷۴ء ، "Separatisma among Indian Muslims; The Politics of the United Provinces' Muslims 1860-1923" ، کیمبرج، کیمبرج یونیورسٹی پریس۔
رالے ، ریتا ، نومبر ۲۰۰۰ء، "A Teleology of Letters; or, From a 'Common Source' to a Common Language (abstract) ، مشمولہ "The Containment and Re-Development of English in India" ، پراکسس سیریز، امریکہ، یونیورسٹی آف میری لینڈ، رومانٹک سرکل۔
برائے انٹرنیٹ مطالعہ:
http://www.rc.umd.edu/praxis/containment/abstracts.html#raley
رائے ، امرت ،۱۹۸۴ء ، "A House Divided" ، نیودہلی، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔
رحمان ، طارق ، ۲۰۰۴ء ، "Language and Education, Selected Documents (1780-2003)" ، اسلام آباد، قائداعظم یونیورسٹی۔
رضیہ نورمحمد، ۱۹۸۵ء ، ''اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' ، لاہور، مکتبۂ خیابان۔
سرہندی ،وارث ، ۱۹۹۰ء ، ''علمی لغت (جامع)''، لاہور، علمی کتب خانہ۔
سکہ، آر-پی- ، ۱۹۸۴ء ، "The Civil Service in India" ، نیودہلی، اپل پبلشنگ ہاؤس۔
سودا، مرزا محمد رفیع، ۱۸۲۵ء ، ''کلیاتِ سودا''، کلکتہ،فورٹ ولیم کالج، (I.O. Islamic 353) ۔
شاکل ، سی- اور آر-اسنیل، ۱۹۹۰ء ، "Hindi and Urdu since 1800: A Common Reader" ، نیودہلی، ہیری ٹیج پبلشرز۔
شل زینو (شلزی)، بنجمن، ۱۹۷۷ء ، "A Grammar of Hindoostani Language" ،(اشاعت اول ۱۷۴۱ء)،لاہور، مجلس ترقی ادب۔
صدیقی، محمد عتیق، ۱۹۶۰ء ، ''گل کرسٹ اور اس کا عہد'' ، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو۔

عبیدہ بیگم ، ۱۹۸۳ء ، ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات'' ، لکھنؤ ، نصرت پبلشرز۔
عقیل، معین الدین، ۱۹۹۴ء ، *"Language and Nationalism: Hindi, a Cause in the Emergence of Separatism in British India"* ، مشمولہ جریدہ "Tokyo Gaikokugo Daigaku Ronshu" ،شمارہ ۴۹، ص ۱۹۹-۲۰۸، ٹوکیو، جاپان۔
فاربس، ڈنکن، (مراتب)، ''باغ وبہار میرامن''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔
فورٹ ولیم کالج، ۱۸۰۵ء ، *"The College of Fort William in Bengal"* ، لندن، مصنفین: ''ٹی کاڈیل'' اور ''ڈبلیو ڈیوس'' (IOR 731, 1, 13/V7727)۔
قدوائی، صادق الرحمٰن، *"Gilchrist and the Language of Hindoostan"* ، نیو دہلی، رچنا پرکشن۔
کشمیری، تبسم، ۲۰۰۳ء ، ''اردو ادب کی تاریخ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔
کنگ، کرسٹوفر، ۱۹۹۴ء *"One Language, Two Scripts: The Hindi Movement in Nineteenth Century North India"* ، دہلی، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔
گرائرسن، جی-اے، ۱۹۲۱ء ، *"Linguistic Survey of India 6-1, Indo-Aryan Family (Central Group) Punjabi- Urdu- Hindostani/ Western Hindi"* ، لاہور، ایکوریٹ پرنٹرز۔
گل کرسٹ، جان بورتھوک، ۱۸۰۳ء، *"The Hindee Story Teller or Expositor of the Roman, Persian an Nagree Characters, Simple and Entertaining Compound, in Thier Application to the Hindoostanee Language, as a Written and Literary Vehicle"* ، (دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۶ء)، کلکتہ، ہندوستانی پریس۔
مجید، جاوید، ۱۹۹۵ء، *"The Jargon of Indostan: An Exploration of Jargon in Urdu and East India Company English"* مشمولہ "Languages & Jargons: Contributions to a Social History of Language" ،ایڈیٹرز: پیٹر برکی اور رائے پورٹر، لندن، پولائٹی پریس۔
میر ، محمد تقی ، ۱۸۱۱ء ، ''کلیات میر تقی''، مشمولہ *"The Poems of Meer Mohummud Tuqee, The Whole of His Numerous Celebrated Compositions in the Oordoo, or Polished Language of Hindoostan"* ، کلکتہ، فورٹ ولیم کالج۔
نوشاہی، عارف، ۲۰۰۴ء ، ''اردو حروف تہجی کے املا کے قواعد پر ایک قدیم فارسی تحریر، دیباچۂ کارستان''، مشمولہ جریدہ ''بازیافت''، شمارہ نمبر ۴، ص ۹۷-۱۱۸، اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویج۔
ہیڈلے، جارج، ۱۷۹۶ء ، *"A Compendious Grammar of the Current Corrupt Dialect of the Jargon of Hindostan (Commonly called Moors), with a Vocabulary English and Moors, Moors and English, with References between Words Resembling*

Each Other in Sound, and Circumlocutory Expressions for Attaining the Idiom of Dialogues, &c, &c., the Language. To Which Are Added Familiar Phrases and With Notes Descriptive of Various Customs and Manners of Bengal For the Use of the Bengal and Bombay Establishment" ، چوتھا ایڈیشن (مزید درستگی، بہتری اور مفصل بیان کے ساتھ)، لندن، جے۔سیویل۔

یولی، ہنری، اور اے۔سی۔برنل ، ۱۹۸۶ء ، "*Hobson-Jobson: A Glossary of Colloquial Anglo-Indian Words and Phrases, and of Kindered Terms, Etymological , Historical, Geographical and Discursive*" ، (اولین اشاعت ۱۸۸۶ء) ، دہلی، روپا۔